www.urduchannel.in

آدمی

(افسانے)

اردو چینل
www.urduchannel.in

محمد حمید شاہد

www.urduchannel.in

آدمی

(افسانے)

محمد حمید شاہد

•••

ہم دو دُنیاؤں میں ہیں
اور ہم آہنگی کی لغات گم ہو گئی ہے

•••

www.urduchannel.in

آدمی

محمد حمید شاہد

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ ©

اشاعت : 2013
کتاب : آدمی
مصنف : محمد حمید شاہد
ناشر : محمد عابد
سرورق : Chennu
تزئین : عبدالحفیظ
قیمت : 300 روپے
مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

Aadmi
by
Muhammad Hameed Shahid
Edition - 2013

اہتمام
مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم
مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، بنشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

www.urduchannel.in

محمد شعیب یونس

محمد حامد اویس

اور

محمد ریان شعیب

کے نام

•••

میں ہڈ بیتی کو لوک بیتی میں ملا کر لکھتا رہا اور جب اپنے تئیں بات مکمل کر لی تو کاغذ ایک طرف رکھ دیا۔ یہ زندگی کی کہانی تھی۔

اُس نے ٹانگیں پساریں، بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور گردن کو ایک جانب لڑھک جانے دیا۔ یہ موت کا جھپنا تھا۔

وقت نے دونوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور چیروں قبر میں دفن کر دیا۔

صرف کاغذ پر لکھے ہوئے وہ لفظ جنہوں نے ہڈیوں کا گودا خون میں ملا کر ڈکوسا تھا گھاس کی طرح اُگ آئے تھے، باقی سب کچھ قبر دبا گئی۔

•••

www.urduchannel.in

ترتیب

پہلی بات	۹
شاخِ اشتباہ کی چٹک	۱۱
ملبا سانس لیتا ہے!	۲۷
کیس ہسٹری سے باہر قتل	۴۵
کتاب الاموات سے میزانِ عدل کا باب	۵۹
بِکلی کلیرِدی	۶۵
آدمی کا بکھراؤ	۷۳
بھرکس کہانیوں کا اندوختہ آدمی	۸۵
کہانی کیسے بنتی ہے؟	۹۳
پارہ دوز	۱۰۱
تھوتھن بھنورا	۱۰۹
کُوک بھرا کھلونا	۱۱۹
اُلٹی ہتھیلی پر رُکی ہوئی گیند	۱۲۵
خالی بٹوا	۱۳۵
گندی بوٹی کا شوربا	۱۴۱
لذتِ تن (بدن برزخ۔۱)	۱۵۵
بس کی پُڑیا (بدن برزخ۔۲)	۱۶۷
ثانیے کی سمن (بدن برزخ۔۳)	۱۸۳

www.urduchannel.in

پہلی بات

''بند آنکھوں سے پرے''(افسانے)،''جنم جہنم''(افسانے)،''مرگ زار''(افسانے) اور''مٹی آدم کھاتی ہے''(ناول) کے بعد نئے افسانوں کا مجموعہ لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔ افسانہ لکھتے ہوئے لگ بھگ ہر بار مجھے یوں لگا کہ جیسے تخلیقی عمل سے جڑنا تو گویا زندگی کو ازسرِ نو تخلیق کرنا ہوتا ہے۔ ایک عجب طرح کے درد سے دہکتے ہوئے الاؤ کو چیر کر پار نکلنا اور ایک اور نوع کی زندگی کا سراغ پالینا یا پھر اس سراغ جیسے سراب میں بھٹک جانا ہی مجھے کہانی لکھنے کی تابنک کا اسیر رکھے ہوئے ہے۔

یقین جانیے میرے لیے، فقط لکھنا اور اس لکھنے کے عمل سے حظ اٹھانا کبھی اہم نہیں رہا، کہ میں تو زندگی کے بھیدوں بھرے کھدّ و کو کھولتے چلے جانے سے، اور ہر تہ کے اُترنے پر بے پناہ حیرت یا شدید صدمے کے مقابل ہو جانے کو ہی تخلیقی عمل کی عطا سمجھتا آیا ہوں۔ سو یہ افسانے بھی انہی لمحوں کی دین ہیں۔ وہ جو کیس ہسٹری سے باہر قتل ہو جاتی ہے یا پھر پہاڑوں سے رزق کی تلاش میں اُتر کر آنے اور زندگی کی اشتہا کا گرفتار ہو جانے والا آدمی ہے، ملبے میں دھنسا ہوا ماسٹر فضل جو، بکھرے ہوئے وجود والا کامران، قدیمی میزانِ عدل پر تلنے والی رُوحیں، کِکلی کلیر گاتی بچیاں، بھرکس کہانیوں کا پشتارہ اُٹھائے اُٹھائے پھرنے والا، بیٹی کا جنازہ اُٹھنے پر بین کرنے والی ماں، وہ مرا ہوا شخص جسے زندگی کے بخیے لگانے تھے، اکیلی رہ جانے والی عورت

جس کی رانوں پر لجلجا اندھیرا گدگدی کیا کرتا، خالی کنستر کی طرح بجتی زندگی والا راوی کردار، کوک بھرے کھلونے کا سا ایک اور کھلونا، ماں کی دودھ جیسی بغل میں جھانک کر مُغلَئی پھوڑے کو آنکھ میں بھر لینے اور لذت تن کا اسیر ہو جانے والا عالم یا پھر وہ لڑکی جس کے اُجلے بدن کو متعفن پانیوں کی دھار نے بھگو دیا تھا، یہ سب کردار میرے وجود کا حصہ ہیں، میری حیرتوں کے رازداں اور میرے دُکھوں کے شریک۔ سو ان افسانوں کو پڑھیے اور اس درد اور اذیت کو آنکیے جو تخلیقی سطح پر زندگی کرنے والوں کا مقدر ہے۔

محمد حمید شاہد

اسلام آباد

www.urduchannel.in

شاخِ اِشتہا کی چٹک

اسے قریب نظری کا شاخسانہ کہیے یا کچھ اور کہ بعض کہانیاں لکھنے والے کے آس پاس کلبلا رہی ہوتی ہیں مگر وہ ان ہی جیسی کسی کہانی کو پا لینے کے لیے ماضی کی دھول میں دفن ہو جانے والے قصوں کو کھوجنے میں جتا رہتا ہے۔

تو یوں ہے کہ جن دنوں مجھے پرانی کہانیوں کا ہوکا لگا ہوا تھا' مارکیز کا ننھا منا نیا ناول میرے ہاتھ لگ گیا۔

پہلی بار نہیں' دوسری بار۔

اگر میرے سامنے مارکیز کا یہ مختصر ناول دوسری بار نہ آتا تو شاید میں اپنے پاس مکر مار کر پڑی ہوئی اس جنس میں لتھڑی ہوئی کہانی کو یوں لکھنے نہ بیٹھ گیا ہوتا۔

مارکیز کے ناول کو دوسری بار پڑھنے سے میری مراد میمن کے اس اردو ترجمے سے ہے جو مجھے ترجمے کا معیار آنکنے کے لیے موصول ہوا تھا۔

یہ وہی ناول تھا جس کی خبر آنے کے بعد میں انگریزی کتابوں کی دکانوں کے کئی پھیرے لگا آیا تھا۔ پھر جوں ہی اس کتاب کا انگریزی نسخہ دستیاب ہوا تو میں نے اسے ایک ہی ہلے میں پڑھ ڈالا۔ میں نے اپنے تئیں اس ناول کو پڑھ کر جو نتیجہ نکالا وہ مصنف کے حق میں جاتا تھا نہ اس کتاب کے حق میں۔

خدا لگتی کہوں گا میرا فیصلہ تھا ایک بڑے لکھنے والے نے بڑھاپے میں جنس کے سستے وسیلے سے اس ننھی منی کتاب میں جھک ماری تھی۔

ممکن ہے یہی سبب ہو کہ جب میمن کا ''اپنی بیسواؤں کی یادیں'' کے عنوان سے چھپا ہوا ترجمہ ملا تو میں خود کو اسے فوری طور پر پڑھنے کے لیے تیار نہ کر پایا اور پیپر بیک میں چھپا یہ مختصر سا ناول کہیں رکھ کر بھول گیا۔ گزشتہ دنوں کسی اور کتاب کی تلاش میں' جب کہ میں بہت زیادہ اکتا چکا تھا' یہ ناول اچانک سامنے آ گیا۔ میں نے اپنی مطلوبہ کتاب کی تلاش کو معطل کر کے اکتاہٹ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ اسی ناول کو تھامے تھامے اپنے بیڈ تک پہنچا' جسم کو پشت کے بل بستر پر دھپ سے گرنے دیا اور اسے یوں ہی یہاں وہاں سے دیکھنے لگا۔ جب میری نگاہ مارکیز کے ہاں بے باکی سے در آنے والے ان ننگے لفظوں پر پڑی جنھیں مترجم نے ایسے دلچسپ الفاظ میں ڈھال لیا تھا جو فوری طور پر فحش نہیں لگتے تھے' تو میں نے ناول کو ڈھنگ سے پڑھنا شروع کر دیا۔

ناول کو اس طرح پڑھنے کے دو غیر متوقع نتائج نکلے۔

ایک یہ کہ میں جسے مارکیز کے کھاتے میں جھک مارنا سمجھ بیٹھا تھا اس میں سے میرے لیے معنی کی ایک مختلف جہت نکل آئی اور دوسرا یہ کہ مجھے اپنا کنی کاٹ کر نکل جانے اور پھر بھول جانے والا ایک کردار شکیل رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ ایک ناول جس کے مرکزی کردار نے اپنی نوے ویں سالگرہ کی رات ایک باکرہ کے ساتھ گزارنے کا اہتمام کیا' میرے لیے اس میں سے زندگی کے کیا معنی برآمد ہوئے' میں ٹھیک ٹھیک بتانے سے قاصر ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بار دگر پڑھنے پر نہ صرف اس ناول کا جنس کا رسیا مرکزی کردار میرے لیے ایک سطح پر قابلِ اعتنا ہوا' میں اپنے ایک متروک کردار شکیل کے بارے میں بھی ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔

اور یہ بات بہ جائے خود کوئی کم اہم بات نہیں تھی۔

شکیل اور مارکیز کے ناول کے مرکزی کردار میں کوئی خاص مشابہت نہیں ہے۔ بتا

www.urduchannel.in

چکا ہوں کہ وہ نوے برس کا ہے جب کہ میرا شکیل بھر پور جوانی لیے ہوئے ہے۔ وہ مرد مجرد اپنی مثالی بدصورتی کی وجہ سے خاکہ اڑانے والوں کا مرغوب' جب کہ جس شکیل کی میں بات کر رہا ہوں وہ محض نام کا شکیل نہیں ہے اور یہ شادی شدہ اور بال بچے دار ہے۔ تاہم ایک بات دونوں میں مشترک ہے کہ دونوں جنس زدہ ہیں اور شکیل تو اسی جنس زدگی کی وجہ سے دوستوں میں تضحیک کا سامان ہو گیا ہے۔ ایک مدت کے بعد شکیل جیسے کردار کی طرف لوٹنے کا سبب مارکیز کے ناول کے بوڑھے کی وہ جنسی خرمستیاں ہیں جنھیں ناول میں بہت سہولت سے لکھ لیا گیا ہے مگر ہمارے ہاں ایسی حرکتوں کو لکھنا چوں کہ فحاشی کے زمرہ میں آتا ہے لہٰذا مجھے شکیل کو لکھنے کے لیے بار بار مارکیز کی طرف دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ہاں تو میں مارکیز کے بوڑھے کی خرمستیوں کا ذکر کر رہا تھا اور بتانا چاہ رہا تھا کہ اس بوڑھے کی ہوس کاریوں کے باب میں جہاں اس کی اجڈ لارنڈی والی ملازمہ کا ذکر آتا ہے' وہی عقب سے جانے کا، وہیں مجھے اس وقت کے شکیل کا' اس کریانہ اسٹور کے مالک کا شکار بننا یاد آیا جس کے پاس اس شہر میں آکر وہ پہلے پہل ملازم ہوا تھا۔ جہاں ناول کے مرکزی کردار نے اپنے پچاس سال کی عمر کو پہنچنے پر ان پانچ سو چودہ عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے اس کا جنسی تعلق قائم ہوا' اور اس گنتی میں وہ بعد ازاں مسلسل اضافہ کیے جا رہا تھا، تو میرے دھیان میں شکیل کی زندگی میں آنے والی وہ چھپنی لڑکیاں آگئیں جن کی وجہ سے وہ شہر بھر میں جنسی بلے کے طور پر مشہور رہا۔

تاہم جس لڑکی کی وجہ سے شکیل کو نظروں سے گرا ہوا اور بعد میں اسے شہر چھوڑتے ہوئے دکھایا جانا ہے وہ بظاہر ان چھپنی لڑکیوں جیسی نہ تھی۔

اوہ ٹھہرے صاحب! مارکیز کے بوڑھے بدصورت کردار کی طرح قابلِ قبول ہو جانے والے جواں سال شکیل کی کہانی کو یوں شروع نہیں ہونا چاہیے' جیسا کہ میں اسے آغاز دے چکا ہوں۔ اس کردار کو عجلت میں یا یہاں وہاں سے ٹکڑوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ڈھنگ سے لکھنے سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میں اپنی اس خفت سے آگاہ کرتا چلوں جو مجھے کسی جنس مارے آدمی سے مل کر اور اس کی لذت میں لتھڑی ہوئی باتیں

سن کر لاحق ہو جایا کرتی ہے۔ اسی خفت کا شاخسانہ ہے کہ مجھے اپنا حوالہ جنس مارے کرداروں سے بھی کھلنے لگتا ہے۔ شکیل جیسا کردار میری دسترس میں رہا مگر اسی خفت نے ہمارے درمیان بہت سے رخنے رکھ دیے تھے۔ حتیٰ کہ میں نے یہ بھی بھلا دیا کہ شروع میں یہ کردار ایسا نہ تھا۔ یہ تو بہت بعد میں ہوا تھا کہ وہ نہ صرف لوگوں کی تضحیک کا سامان بنا' میری نظروں سے بھی گر گیا تھا۔

لیجیے اب مارکیز کے بوڑھے نے مجھے بہلا پھسلا کر اس مردود کہانی کے قریب کر ہی دیا ہے تو میں اسے شکیل سے اپنی پہلی ملاقات سے شروع کرنا چاہوں گا۔

شکیل سے میری پہلی ملاقات کسی تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں دوسرے شاعروں کی طرح اپنی غزل سنانے آیا تھا۔ صاف اور گورا رنگ جو ناک کی پھنگی' کانوں کی لووں اور چمک لیے نرم نرم گالوں سے قدرے شہابی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا ٹھہر ٹھہر کر شعر پڑھنا اور پڑھتے ہوئے مصرعے کو ایک ادا سے دہرانا اچھا لگا تھا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ پہاڑیا ہے تو اور بھی اچھا لگا کہ وہ اس کے باوجود نہ صرف ہر مصرع میں ٹھیک ٹھیک لفظ باندھنے کا اہتمام کر لایا تھا ان کی ادائیگی میں بھی کوئی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ جو غزل اس نے وہاں سنائی اس نے خوب سلیقے سے کہی تھی۔ اس کی فنی مہارت کا میں یوں قائل ہو گیا تھا کہ ساری غزل ایک روندی ہوئی بحر میں، مگر بہت عمدگی سے کہی گئی تھی۔ اس میں ایک دو غیر شاعرانہ اور کھدرے لفظوں کو اتنا ملائم بنا کر رواں مصرعوں میں پیوست کر دیا گیا تھا کہ اب وہ غزل کے ہی الفاظ لگتے تھے۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ وہ لگ بھگ ہر شعر کے مصرع اولیٰ میں اپنے خیال کی کچھ اس طرح تجسیم کر رہا تھا کہ ہر بار لہجے کے نئے پن کا احساس ہوتا اور ایک ایسا مقدمہ بھی بنتا تھا جس کی طرف سننے والے کا متوجہ ہونا لازم ہو جاتا۔

جب وہ شعر مکمل کر کے سانس لیتا تو بات بھی مکمل ہو جاتی تھی۔

ذرا گماں باندھیے کہ ایک نوخیز شاعر ہے۔ آپ اس سے بالکل نئے لہجے کی غزل سن رہے ہیں۔ ایک ایسا لہجہ، جس میں عصر موجود کا تناظر اس کی اپنی لفظیات کے ساتھ سامنے آرہا

www.urduchannel.in

ہے۔اس غزل میں اس کا اہتمام بھی ہے کہ کوئی لفظ فن پارے کے مجموعی مزاج میں اجنبی نہیں لگتا۔ سلیقہ ایسا کہ ہر لفظ کی ادائیگی کا مخرج ضرورت شعری کی وجہ سے کہیں بھی بدلا نہیں گیا۔ ہر لفظ ٹھیک اپنی نشست پر، اور وہ بھی یوں کہ ایک لفظ کی صوتیات اگلے لفظ کو ٹہوکا دینے کی بجائے اس میں اُتر کر اس کی اپنی صوتیات میں منقلب ہو جاتیں۔ سچ پوچھیے تو ایسی باریکی سے غزل کہنے والے کا گمان ہی باندھا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ میرے سامنے تھا اور پورے قرینے سے غزل کہہ رہا تھا۔

لہٰذا میں اس کے قریب ہو گیا۔ اتنا قریب کہ ہم دونوں کے درمیان سے سارا حجاب اُٹھ گیا۔

جب وہ اسی شہر میں رہ کر خوب خوب داد بے پناہ حسد اور بہت ساری نفرت اور تضحیک سمیٹ چکا تو بھی میں اس کے قریب رہا۔ پہلے پہل شکیل کے بارے میں شہر کے شاعروں نے یہ شوشا چھوڑا' ہو نہ ہو اسے کوئی لکھ کر دیتا ہے۔ جب لوگ تجسس سے پوچھنے لگے کہ وہ کون ہے جو اسے لکھ کر دیتا ہوگا؟ تو ایک ایسے بزرگ شاعر کا نام چلا دیا گیا جو کہنے کو شعر خوب سلیقے سے کہتے اور عادت ایسی پائی تھی کہ خوش شکل لونڈوں میں اٹھنے بیٹھنے کو اس گئے گزرے زمانے میں بھی چلن کیے ہوئے تھے۔ کسی کو ایسی باتوں پر یوں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ حضرت زبان کے روایتی استعمال تک محدود رہتے تھے اور اچھا اور پکا مصرعہ کہنے کے باوجود خیال کو نیا بنا لینے پر قادر نہ تھے۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا تھا کہ کوئی خود تو فنی طور پر بے عیب مگر بوسیدگی کا احساس جگانے والا مصرعہ کہنے کو تیرہ کیے ہو اور اپنے لونڈے کو حرف تازہ سے فیض یاب کرے۔ جب شکیل ایک سے بڑھ کر ایک تازہ غزل لانے لگا تو اس کے خلاف فضا باندھنے والوں کی جیبھیں خود بخود اپنے اپنے تالو سے بندھ گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اس نے اپنے جیسے شاعروں سے آگے نکل کر حاسدین کا گروہ پیدا کر لیا تھا۔ جو لوگ شعر میں اسے مات نہیں دے سکتے' اس کی شخصی کمزوریوں کو اچھال کر تسکین پاتے تھے۔

مجھے شکیل سے یہ شکایت تھی کہ آخر وہ اس باب میں انھیں خوب خوب مسالا کیوں

فراہم کر رہا تھا۔ وہ میری بات سنتا اور ڈھٹائی سے ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔

دوبارہ کہو سے پرے پہاڑوں کے اُدھر جس گاؤں سے آیا تھا اس کا نام تک گل تھا جو بول چال میں مختصر ہو کر تگلی ہو گیا تھا۔ جب وہاں اس نے دس جماعتیں پڑھ لیں تو آگے کرنے کو کچھ نہ تھا۔ اس کے باپ کے پاس جو تھوڑی سی موروثی زمین تھی' اسے گزشتہ سال کی مسلسل بارشوں میں لینڈ سلائیڈ کھا گئی تھی۔ مینک کر لینے کے بعد اس کے لیے دو ہی راستے تھے۔ باپ کی طرح مری چلا جائے اور وہاں سیزن لگنے پر ہوٹلوں میں بیرا گیری کرے یا ادھ شہ میں کسی دکان پر سیلز مین ہو جائے۔ جیسا کہ اس کے گاؤں کے کئی اور لڑکوں نے کیا تھا۔

اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

تگلی کا ایک شخص دل محمد ادھ شہ میں ایک کریانے کے اسٹور پر ملازم تھا۔ وہ بقرعید پر گاؤں آیا تو شکیل کے باپ نے اس سے بات کی۔ اس نے فوری طور پر تو اسے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ وہاں شہر میں کام کرنے کے خواہش مند لڑکے ہر روز آتے رہتے تھے جو کم اجرت پر کام کرنے کو تیار ہو جاتے لہٰذا شکیل کو وہاں بھیجنا' لڑکے کو ایک لحاظ سے ضائع کرنا ہی ہوگا۔ اس کے باپ نے دل محمد کی نصیحت کو محض ٹالنے کا بہانہ سمجھا۔ وہ اپنے مالک کو بڑا خسیس اور گھٹیا کہہ رہا تھا جو کم اجرت دیتا اور کام زیادہ لیتا تھا۔ یہ سب کچھ درست ہو سکتا تھا مگر دل محمد کے گھر والوں کی گزر بسر ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی لہٰذا اس نے خوب منت سماجت کر کے اسے مجبور کر لیا کہ وہ شکیل کو شہر لے جائے اور اپنے مالک سے ملا دے، آگے رہی اس کی قسمت۔ دل محمد نے جو کہا، وہ جھوٹ نہیں تھا۔ اس کا مالک نام کا گل زادہ تھا، نکلا پورا حرام زادہ۔ اسے دیکھتے ہی اس کی رائیں ٹپنے لگی تھیں۔

شکیل نے پہلے روز اس کی رائیں نہیں دیکھی تھیں کہ وہ تو اپنی ضرورت اور اپنی مجبوریوں کو دیکھ رہا تھا۔

گل زادہ نے شکیل کی رہائش کا بندوبست دل محمد کے ساتھ دکان کے پچھواڑے میں

www.urduchannel.in

کرنے کی بجائے اوپر والے فلیٹ میں اپنے ساتھ کیا۔ اس نے اپنے ساتھ اپنے مالک کو یوں مہربان پایا تو اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ دوسری تنخواہ تک وہ اس پر خوب مہربان رہا اور جب اس بار بھی تنخواہ کی رقم کا منی آڈر گھر بھیج چکا تو ایک رات وہ اس کے بستر میں گھس گیا۔ سردیوں کے دن تھے' پہلے پہل اس کا یوں لحاف میں گھس آنا شکیل کو برا نہ لگا تھا تاہم رفتہ رفتہ شکیل پر اس حرام زادے کی نیت کھلی پھر وہ خود ہی کھلتا اور اسے کھولتا چلا گیا۔ بعد میں وہ یہ واقعہ اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے قہقہہ لگا کر سنایا کرتا۔

تاہم وہ یہ بھی کہتا کہ وہ جس مشکل میں پڑ گیا تھا اس سے ہمت کر کے نکل آیا تھا۔

جب میں نے شکیل سے اس کا یہ قصہ سنا، تو بات ایک قہقہے پر نہیں رُکی تھی۔ قہقہے کی آواز ابھی معدوم نہیں ہوئی تھی کہ فوراً بعد اس کے حلقوم میں ہچکیوں کی باڑھ امنڈ پڑی تھی۔ اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دے کر کاٹ ہی ڈالا تھا۔ شکیل نے ذرا سنبھلنے کے بعد یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا مالک اس پر ایسے میں کھل رہا تھا جب وہ ان سہولتوں کا عادی ہوتا جا رہا تھا جو اس نے گاؤں میں دیکھی تک نہ تھیں۔ اس کے باپ کے پاس بھی ایک معقول رقم پہنچنے لگی۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے اپنے باپ کو اتنی رقم بھیج دی، جتنی اس نے کبھی اپنے باپ کے پاس یکمشت دیکھی ہی نہ تھی۔ اپنے ہی باپ کا کفیل بننے میں اسے لطف آنے لگا۔ یہی لطف تھا کہ جس نے اسے فوری طور پر بے روزگار ہونے کے لیے تیار نہ ہونے دیا۔ بعد میں جب راتیں مسلسل لذت اور کراہت کے بیچ گزرنے لگیں تو اس کا دل شدت سے اُلٹنے لگا۔ وہ وہاں ٹھہرا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اس شخص سے شدید نفرت محسوس کرنے لگا۔ یہ نفرت اتنی شدید تھی کہ ایک رات، جب کہ اس کا مالک اوندھا پڑا اس کا انتظار کر رہا تھا، وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔

جس روز وہ گل زادہ کی ملکیت اور اس کے فلیٹ سے نکلا تھا' اس روز اس نے صاف صاف ایک لذیذ سنسناہٹ کو اوندھے پڑے بھاری چربیلے بدن میں ریڑھ کی ہڈی سے دمچی کی طرف بہتے ہوئے پایا تھا۔

مارکیز کا ناول دوسری بار پڑھنے کے بعد اب اگر میں اس دن کی بابت سوچوں' جس روز شکیل نے مجھے اپنا یہ قصہ سناتے ہوئے قہقہہ لگایا اور فوراً بعد اپنے دم کو ہچکیوں کا پھندا لگا لیا تھا تو مجھے شکیل کی جگہ مارکیز کے ناول کی وہ باکرہ لڑکی یاد آجاتی ہے جسے نوے سالہ بوڑھے نے دیلگدینہ کا نام دیا تھا۔ دیلگدینہ' جو پانچ دسمبر کو محض پندرہ سال کی ہو رہی تھی مگر جسے اپنے گھر کے اخراجات چلانے کے لیے شہر سے باہر دن میں دو بار بٹن ٹانکنے جانا پڑتا تھا۔ اس لڑکی کو ایک دن میں، جب سوئی اور انگشتانے سے، سو سو بٹن ٹانکنا پڑتے تو وہ ادھ موئی ہو جاتی۔ دیلگدینہ اور شکیل کو میں ایک ساتھ یوں دیکھ رہا ہوں کہ دن بھر اپنے مالک گل زادہ کا کریانہ بیچتے اور گاہکوں کے نہ ٹوٹنے والے رش سے نپٹتے نپٹتے شکیل بھی بالکل اس لڑکی کی طرح ادھ موا ہو جاتا۔ تاہم ان دونوں کو کہانی کے اس مرحلہ پر ایک جیسی مشقت میں پڑا دکھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دونوں کہانیوں کے باقی مراحل بھی ایک جیسے ہوں گے۔ شکیل' جو اپنے مالک کی دمچی میں سنسناہٹ چھوڑ کر نکل آیا تھا' بعد میں بہت خوار ہوا۔ تاہم ایک روز آیا کہ ایک دوسرے شخص نے نہ صرف اسے اپنے ہاں ملازمت دی' اس کے نکاح میں اپنی بیٹی صفیہ بھی دے دی تھی۔

شکیل ملازمت کے لیے آیا اور گھر داماد ہو گیا تھا۔

وہ خوب رُو تھا اور سلجھا ہوا بھی۔ ہمت کی بھی اس میں کمی نہ تھی۔ وہ ضرورت مند تھا اور ایک لحاظ سے دیکھیں تو شرف اللہ بھی ضرورت مند تھا، اس کی بیٹی کنواری رہ گئی تھی۔ یہ ایسی ضرورت تھی جس کے لیے شکیل کی کسی بھی ضرورت کو پورا کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اس نئے گھر میں اس کے بارے میں بھی ویسا ہی سوچا جانے لگا جیسا کہ ایک بیٹے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ صفیہ' شرف اللہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے پاس جو کچھ تھا، اُسی کا تھا۔ دونوں کے بہتر مستقبل کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ شکیل کالج میں داخلہ لے لے۔ سال بھر کی ملازمت اور خواری کے بعد شکیل فوری طور پر مزید پڑھنے کی طرف راغب نہ ہو پایا۔ جب اس کی بیوی نے ایک شفیق ماں کی طرح اس کا حوصلہ بڑھایا اور سسر نے یقین دلایا کہ تعلیم پر اُٹھنے والے سارے

اخراجات وہ خود اُٹھائیں گے تو اُس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔

یہیں وہ شاعری کی طرف راغب ہوا تھا۔

جن دنوں میں شکیل کی طرف متوجہ ہوا اس نے ایم اے کر لیا تھا اور ایک غیر سرکاری کالج سے وابستہ تھا۔ شام کو وہ اسی کالج میں چلنے والی اکیڈمی میں پڑھا کر خوب کما بھی رہا تھا تاہم اس بارے میں مطمئن نہ تھا اور کچھ نیا کرنے کی بابت مسلسل سوچا کرتا۔ ان دنوں اس شہر میں پراپرٹی کا کاروبار بہت عروج پر تھا۔ اس نے دو ایک ایسے سودے کمیشن کی بجائے 'ٹاپ' یعنی پلاٹ نقد اُٹھا کر بیچنے کی بنیاد پر کیے۔ ان سودوں نے اسے اتنا مارجن دیا کہ وہ یکسوئی سے اس کاروبار میں جت گیا۔ پھر تو ٹاپے پر ٹاپا اترنے لگا اور اس کے حالات بدلتے چلے گئے۔

اس کے حالات ہی نہیں بدلے وہ خود بھی بدلتا چلا گیا۔

شہر بھر کے ان شاعروں نے سکھ کا سانس لیا جو مشاعروں میں سب کی ساری توجہ سمیٹ لینے پر اس سے نالاں رہتے تھے کہ اب وہ ادھر آتا ہی نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ اس نے تقاریب میں آنا یک دم موقوف کر دیا تھا۔ پہلے پہل اس میں تعطّل کے وقفے پڑے۔ پھر جب کبھی وہ آتا تو مجھے بھی ساتھ اُچک کر باہر لے جاتا کہ اسے سننے سنانے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ گاڑیاں بدلنا اس کا معمول ہوتا جا رہا تھا کہ اس کاروبار میں بھی اس نے اچھی خاصی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔

یہ بدلا ہوا شکیل دیکھ کر میں اُس شکیل کی بابت سوچنے لگتا تھا جسے پہاڑوں سے آتے ہی مجبور پا کر گل زادہ نے پچھاڑ لیا تھا۔

شروع شروع میں' میں سمجھتا رہا تھا کہ وہ صفیہ سے شادی کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں جس طرح آسائشیں آ رہی تھی ان کے جھانسے میں وہ خود بھی ایک مدت تک یوں ہی سمجھتا رہا تھا۔ اس عورت کے بطن سے اس نے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا کیں۔ بقول اس کے اسے اپنے بچوں سے بہت محبت تھی۔ یہ بعد کی بات ہے کہ اس نے گاڑیاں اور لڑکیاں

www.urduchannel.in

بدلنا مشغلہ بنا لیا تھا۔ ان دنوں اس نے نہ صرف صفیہ کا بلکہ ان تینوں بچوں کا ذکر بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کہا نا کہ میں شکیل کے بہت قریب تھا۔ یہ بھی بتا دوں کہ اس کے بیوی بچے مجھ سے بہت مانوس تھے تاہم کہتا چلوں کہ جس تیزی سے وہ ان سے دور ہوا' میں بھی انھیں ملنے سے کترانے لگا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شکیل کے سب لچھن جان گئے ہوں گے۔ میں ان کے سامنے جاتا تو ممکن تھا کہ صفیہ اس حوالے سے بات چھیڑ کر میری مدد مانگ لیتی۔ میں جانتا تھا جس لذّت کی دلدل میں وہ اُتر چکا تھا کوئی بھی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ حتیٰ کہ میں بھی۔ میں نے اپنے تئیں ایک آدھ بار بچوں اور صفیہ کا ذکر کر کے اسے اس دلدل سے نکالنا چاہا تھا۔ بچوں کے نام پر تو وہ چپ ہو گیا مگر صفیہ کا ذکر آتے ہی اس نے ویسا ہی قہقہہ لگایا جیسا کہ وہ گل زادہ کا نام آنے پر لگایا کرتا تھا۔

گل زادہ اور صفیہ میں اگر کوئی مشابہت ہو سکتی تھی تو وہ دونوں کا بھاری بھرکم وجود تھا جو تھل تھل کرتا تھا۔

ایک اور بات جو مجھے ہمیشہ اُلجھن میں ڈالتی رہی وہ شکیل کا صفیہ کے ذکر پر عجب طرح کا قہقہہ لگانا تھا' ایسا قہقہہ کہ بات محض اس مشابہت تک محدود نہ رہتی تھی۔

صفیہ' شکیل سے عمر میں نو دس سال بڑی ہو گی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد تو وہ اس کے مقابلے میں کہیں بوڑھی دکھائی دیتی تھی۔ تاہم وہ اس کے بچوں کی ماں تھی اور اس کا یوں اس کی توہین کرنا مجھے بہت کھلتا۔ جس روز وہ ایک قیمتی گاڑی پر آ کر مجھے تقریب سے اٹھا کر ایک ہوٹل لے گیا تھا' اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کی عمر کے آدمی کے لیے ایک جوان عورت کے وجود کی کیا اہمیت تھی۔ اسی روز اس نے اپنے موبائل کے قدرے زیادہ پکسل والے کیمرے سے لی گئی پانچ مختلف لڑکیوں کی تصاویر دکھائی تھیں جن میں سے ایک تصویر تو ایسی تھی جس میں وہ خود بھی موجود تھا۔ موبائل کا ڈسپلے بڑا' اور تصویریں خوب شوخ' شفاف اور روشن تھیں۔ جس تصویر میں وہ خود موجود تھا' اس کے آگے کو جھکے ہوئے دائیں کندھے سے، میں نے اندازہ لگایا کہ اسی سمت کے بازو کو آگے بڑھا کر یہ تصویر اس نے اپنے سیل کے کیمرے سے خود

www.urduchannel.in

کھینچی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ایسی لڑکی تھی جس کی عمر ہو نہ ہو اس کی اپنی بڑی بہن سونیا جیسی تھی۔ لڑکی اور وہ خود بھی جہاں تک تصویر میں نظر آ رہے تھے لباس کی تہمت سے پاک تھے۔ اگر چہ تصویر میں سے لذت اُبلی پڑ رہی تھی مگر سونیا سے اس تصویر والی لڑکی کی مشابہت قائم کرتے ہوئے میں سارا مزا کرکرا کر بیٹھا تھا۔

مجھے سونیا سے اس لڑکی کا موازنہ نہیں کرنا چاہیے تھا، جس کے ساتھ، بقول شکیل کے، اس نے نوٹوں میں تولنے کے بعد ایک رات کی رفاقت پائی تھی۔

ماننا پڑے گا کہ مارکیز کی کہانی کا بوڑھا عورتوں کی گنتی کے بارے میں کہیں آگے تھا۔ تاہم یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ان عورتوں پر خرچ کے معاملے میں (اگر فی کس عورت کے حساب سے خرچ کا تخمینہ لگایا جائے تو) شکیل کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ یہ بھی بجا کہ مارکیز کا بوڑھا صحافی' جسے چکلہ چلانے والی روسا کبرکس "اے میرے اسکالر" کہہ کر مخاطب کرتی تھی' جس عورت سے بھی (اس ناول کے ترجمہ کار کی اصطلاح میں جفتی کا) تعلق بنانا چاہتا' اسے معاوضہ ضرور ادا کیا کرتا تھا' لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ تھا پرلے درجے کا کنجوس۔ اگر آپ نے یہ ناول مکمل طور پر پڑھ رکھا ہے تو آپ کی نظر میں اسی مرکزی کردار کا اعترافی بیان ضرور گزرا ہوگا جس کے مطابق وہ بخیل آدمی تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر تو ہو نہ ہو آپ کی ہنسی ضرور خطا ہوگئی ہوگی جہاں اس جنس زدہ بوڑھے نے اپنی نوے ویں سالگرہ کی رات ایک باکرہ کے ساتھ گزارنے کے لیے خرچ کا حساب چودہ پیسو لگایا تھا۔ یعنی اخبار سے ملنے والے پورے ایک ماہ کی کالم نویسی کے معاوضے کے برابر۔ پھر جس طرح اس بوڑھے نے پلنگ کے نیچے کے مخفی خانوں سے عین حساب کے مطابق ریزگاری نکالی تھی' دو پیسو کمرے کا کرایہ' چار مالکہ کے لیے' تین لڑکی کے واسطے' پانچ رات کے کھانے اور اوپر کے خرچے کے لیے' سچ پوچھیں تو یہ پڑھ کر میری ناف سے ہنسی کا گولا اُٹھا اور میرے جبڑوں کو اتنا دور اچھال گیا تھا کہ وہ بہت دیر بعد ہی واپس اپنی جگہ پر آپائے تھے۔ میری کہانی کا شکیل ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اس معاملے میں بھی گن گن کر خرچ کرتے ہیں۔ یہ جو اس نے لڑکی کو نوٹوں میں تولنے کی بات کی تھی تو اس سے

قطعاً اس کی یہ مراد نہیں تھی کہ اسے اپنا بہت سارا روپیہ خرچ ہو جانے کا احساس تھا۔

وہ تو اس لڑکی کے دام بالا بتا کر اس کی قدر و قیمت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

''اپنی سوگوار بیسواؤں کی یادیں'' نامی کتاب میں عین وہاں سے کہانی جنس کا چلن چھوڑ کر محبت کی ڈگر پر ہو لیتی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ قحبہ خانے کے ایک اہم گاہک کو پویلین کے پہلے کمرے میں کوئی چاقو مار کر قتل کرنے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ کہانی کے بوڑھے اسکالر نے جب خون سے لت پت بستر پر اُبلے ہوئے مرغ کی طرح پیلے ہو جانے والے اس کیم شحیم آدمی کی لاش کو پڑے دیکھا تھا تو اس کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی نہ تھی۔ کہانی کا یہ حصہ پڑھ کر پہلے تو میرے وجود میں سنسنی دوڑی مگر جب یہ بتایا گیا کہ اس ننگی لاش نے جوتے پہن رکھے تھے تو میری ایک بار پھر ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ مارکیز نے کہانی کے اس حصے میں جنس کا میٹھا اس مردے پر مل کر اسے لذیذ بناتے ہوئے بتایا ہے کہ مقتول کا جسم ابھی اکڑا نہیں تھا۔ اس کی گردن پر ہونٹ کی شکل کے دو زخم تھے اور یہ کہ موت کے باعث اس کے سکڑے ہوئے عضو پر ایک کونڈم ہنوز چڑھا ہوا تھا۔ کہانی لکھنے والے نے یہ وضاحت کرنا بھی ضروری جانا ہے کہ کونڈم غیر استعمال شدہ دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں مجھے مترجم سے اپنی ایک شکایت ریکارڈ پر لانی ہے اور اسے داد بھی دینی ہے۔ شکایت کا یہ موقع وہاں وہاں نکلتا رہا ہے جہاں اس نے اردو جملوں کو بھی ترجمہ کیے جانے والے متن کے قریب رکھ کر انھیں پیچیدہ بنا دیا۔ ناول کے نام کے ساتھ بھی یہی رویہ روا رکھا گیا ہے جب کہ اسے تھوڑا سا بدل کر رواں کرنے کے لیے ''اپنی سوگوار بیسواؤں کی یاد میں'' کر دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اور اب مجھے برملا اس جرات اور سلیقے کی داد دینی ہے جس کو روبہ عمل لا کر اس نے ان لفظوں کا ترجمہ کر لیا ہے جو بالعموم ہمارے ہاں شائستگی کے تقاضے کے پیش نظر زبان پر نہیں لائے جاتے ہیں۔ تاہم اس کا کیا کیجیے کہ کونڈم کا ترجمہ کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا۔

شاید اس لفظ کا ترجمہ کرنا اس کے بس میں تھا ہی نہیں۔

یہاں شکیل سے متعلق دو واقعات کہانی میں گھسنے کو بے تاب ہیں۔ مزے کی بات یہ

www.urduchannel.in

ہے کہ پہلا واقعہ خود بخود آگے چل کر دوسرے واقعے سے جڑ جاتا ہے۔ پہلے واقعہ کا تعلق ان دنوں سے ہے جن دنوں اس کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے مڈل اسٹنڈرڈ امتحان کی تیاری کے لیے یونین کونسل مسیاڑی کے دفتر میں اضافی پڑھائی کا اہتمام کیا تھا۔ امتحانوں تک اسے اور اس کے ہم جماعتوں کو وہیں رہنا' پڑھنا اور رات گئے وہیں سونا تھا۔ یہ قصہ شکیل بہت مزے لے لے کر اور خوب کھینچ تان کر سنایا کرتا مگر مختصراً یوں ہے کہ جب ماسٹر صاحب چلے جاتے اور دن بھر پڑھ پڑھ کر اکتائے ہوئے لڑکوں کو کچھ نہ سوجھتا' تو وہ ملحقہ کمرے میں خاندانی منصوبہ بندی والی دواؤں کے ساتھ پڑے ہوئے چمکیلے لفافوں میں بند سفید غبارے چوری کر کے خوب پھلایا کرتے تھے۔ یہ غبارے اگرچہ اس طرح رنگین نہ تھے جیسے تنگلی میں سُو دے کی ہٹی پر ملتے تھے مگر ان میں ایک ایسی خوبی تھی جو ان رنگین غباروں میں بھی نہ تھی کہ یہ ہوا بھرنے پر بہت پھولتے تھے۔ وہ سب اس پر خوش تھے کہ ان کے ہاتھ بہت سے چٹے خمور غبارے لگ گئے تھے اور رات گئے ان میں اس پر مقابلہ لگا رہتا تھا کہ کون انھیں سب سے زیادہ پھلائے گا۔ شکیل کے مطابق ان دنوں ان غباروں پر سفید رنگ کا سفوف ملا ہوتا تھا جس سے ان کے ہونٹ اور گال یوں ہو جاتے تھے جیسے ان پر آٹا مل دیا گیا ہو۔ اسی سفیدی نے ان کی شرارتوں کا پول ہیڈ ماسٹر صاحب پر کھول دیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو پہلے تو غصہ آیا پھر کچھ سوچتے ہوئے ہنس پڑے اور کہا ''نامعقولو! یہ ناپاک ہوتے ہیں کہ ان میں بیمار پیشاب کرتے ہیں۔''

اگلے روز ساتھ والے کمرے پر تالا نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ ضرور تجربہ کرتے کہ ان غباروں کو بیمار کیسے استعمال کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات انھیں مزید الجھا گئی تھی۔

اسی شکیل نے' کہ جسے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک زمانے میں الجھا دیا تھا' اب اس اُلجھن سے پوری طرح نکل آیا تھا۔ اس نے مجھے لگ بھگ ویسے ہی کھلے منہ والے غبارے کی اپنے سیل فون کے قدرے زیادہ پکسل والے کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر تب دکھائی تھی جب میں اجلاس سے اُٹھ کر اس کے ساتھ ہوٹل آ گیا تھا اور جب وہ اپنی دوست لڑکیوں کی پانچوں تصویریں دکھا چکا تھا۔ مجھے اس کا سنایا ہوا اوپر والا واقعہ عین اس موقعے پر

یوں یاد آیا کہ تصویر میں بھی لگ بھگ ویسا ہی غبارہ تھا۔ تصویر والا غبارہ بالکل سفید نہ تھا' ایسی جلد کی رنگت لیے ہوئے تھا جس میں چمک بھی آ گئی تھی۔ میں نے کراہت کو اپنے حلقوم تک آتے پا کر اس کا سیل فون اسے لوٹانا چاہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی پھسلتی ہوئی ایک نظر اس غبارے پر ڈال لی۔ مجھے صاف دِکھ رہا تھا کہ اس میں کسی بیمار نے پیشاب تو نہ کیا تھا تاہم کچھ تھا جس سے وہ ذرا سا پھول کر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ ساری لڑکیاں جن کی اس نے تصویریں بنا رکھی تھیں یا ان جیسی دوسری لڑکیاں جو کیمرے والا موبائل دیکھتے ہی بدک جاتی تھیں' ایک ایک کر کے اس کی زندگی سے نکل گئیں اور ان سب کی جگہ عائلہ لے لی تھی۔

بتایا جا چکا ہے کہ مارکیز کے لذّت مارے بوڑھے کی دیلگدینہ پانچ دسمبر کو پندرہ برس ن .ونی تھی اور کہانی میں جب سالگرہ والی رات آتی ہے تو بوڑھے اسکالر کی حرکتیں پڑھ کر گمان سا ہونے لگتا ہے کہ جیسے اسے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہو گی مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اسے پورا گانا سنا کر اور پورے بدن پر بوسے دے کر ایک بے قابو مہک جگانا چاہتا تھا۔

اس روز وہ اس بے قابو مہک کو جگا کر اور خوب تھک کر وہ سو گیا تھا۔

اس کی محبت تو تب جاگی تھی جب قتل والی رات کے بعد دیلگدینہ اور اس کا ملنا ایک عرصے تک ممکن نہ رہا تھا۔ اس کے بعد کے صفحات بوڑھے اسکالر کی اس لڑکی کی محبت میں تڑپ کا احوال سمیٹے ہوئے ہیں۔ شکیل کی کہانی میں عائلہ لگ بھگ اسی طرح کی تڑپا دینے والی محبت کے لیے موزوں ٹھہرتی ہے جس طرح کی محبت مارکیز کے مرکزی کردار کو اس پندرہ سالہ لڑکی سے تھی' تاہم اتنی ساری مشابہتوں کے باوجود شکیل کی کہانی بہت مختلف ہو جاتی ہے۔

عائلہ کو لے کر شکیل نے یہ شہر چھوڑ دیا تو مجھے اس کی اس حرکت پر شدید صدمہ پہنچا۔

جس خاندان نے اس شخص کو شہر میں آسرا دیا' اس خاندان سے اس نے وفا نہ کی تھی۔

شکیل سے قربت کی وجہ سے میں جانتا ہوں کہ صفیہ نے اپنی ذات مٹا کر اس کی خدمت اور محافظت کی تھی۔ جس طرح مائیں اپنی اولاد کے عیب چھپا کر اور ان کی خطاؤں کو بھول کر انھیں

www.urduchannel.in

اپنی محبت کی چادر سے باہر نہیں نکالتیں بالکل اسی طرح کی مسلسل اور بے ریا محبت اسے صفیہ سے ملی تھی۔ جب کئی روز بعد شکیل کے یوں شہر چھوڑنے کی خبر ملی تو میں بھابی کا دکھ بانٹنے اس کے گھر پہنچ گیا، اس خدشے کے باوجود کہ مجھے وہ جا کر اپنے دوست کے حوالے سے ناحق خجالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ شکیل کی ساری حرکتوں کا اندازہ صفیہ کو تھا۔ دونوں بچیاں مجھے دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گئیں تاہم صفیہ یوں حوصلے میں تھی جیسے وہ شکیل سے جدائی اور بے وفائی کا وار سہہ گئی ہو۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو اس کا سبب کچھ اور تھا۔

شاید یہ دونوں کی عمر کا وہ تفاوت تھا جس نے عین آغاز ہی سے دونوں کے بیچ شدید اور تند جذبوں والا تعلق قائم نہ ہونے دیا تھا۔ تاہم وہ پریشان تھی، اتنا کہ جتنا کوئی اپنی بے انتہا قیمتی شے کے کھو جانے پر پریشان ہو سکتا تھا۔ یہ ماں کے پیار والا سارا احساس مجھے تب محسوس ہوا تھا جب اس نے اپنے بیٹے شہباز کو دیکھا تھا۔ شہباز لگ بھگ اس عمر کو پہنچ گیا تھا جس عمر میں شکیل اس شہر آیا تھا۔ جب اس کی ماں نے یہ بتایا کہ شہباز نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا اور کسی دکان پر کام کر کے اس گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں تو میں نے دیکھا شکیل کے دل گرفتہ بیٹے کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا تھا اور اس نے اپنی مٹھیاں اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔

مارکیز نے آخری پیراگراف لکھتے ہوئے بوڑھے اسکالر کے گھر کے باورچی خانے میں دیلگدینہ کو اپنی پوری آواز سے گا تا دکھا کر اپنی کہانی کو رومانوی جہت دے دی تھی۔ مگر میری اس کہانی کا المیہ یہ ہے کہ اپنے خاتمے پر اس سے سارا رومان اور ساری لذت منہا ہو گئی ہے۔ شکیل اپنے ساتھ بھاگ جانے والی لڑکی سے بھی اوب چکا ہے۔ جس عمر میں اسے یہ سیکھنا تھا کہ شدید اور الہڑ جذبوں کو طول کیسے دیا جاتا ہے وہ سدھائے ہوئے جذبوں سے نبٹتا رہا تھا۔ وہ واپس آیا تو سیدھا گھر نہیں گیا میرے پاس آیا شاید وہ اپنے گھر کی دہلیز ایک ہی ہلے میں پار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ میں اسے رات بھر حوصلہ دیتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ اس کے بیوی بچوں کو اس کی ضرورت تھی اور یہ کہ اس کے اپنے گھر میں اس کا انتظار ہو رہا تھا مگر اگلے روز جب

میں اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تو اس کے بیٹے نے اس پر پستول تان لیا۔ صفیہ نے واقعی اپنے شکیل کو معاف کر دیا تھا تب ہی تو اس نے یوں پستول تاننے پر اپنے بیٹے کی چھاتی پیٹ ڈالی تھی۔ شہباز نڈھال ہو کر دہلیز پر ہی بیٹھ گیا۔ صفیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر اسے الانگھا اور اپنے شوہر کی طرف لپکی۔ دہلیز پر بیٹھے نوجوان کے ہاتھ میں جنبش ہوئی اور اگلے ہی لمحہ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ایک کربناک چیخ میرا وجود چیر گئی تھی۔

×××÷×××

www.urduchannel.in

ملبا سانس لیتا ہے!

جب آدمی کے پاس فرشتے اُترے

ماسٹر فضل جُو ٹھیک ٹھیک آنکنے میں ناکام رہے تھے کہ انھوں نے کتنی دیر تلاوت کی تھی۔ رمضان کے عین آغاز میں ہی وہ تخمینہ لگا چکے تھے کہ روزانہ اتنا پڑھیں گے تو ستائیسویں کو ختم القرآن کی مطلوبہ تعداد مکمل ہوگی۔ مگر جوں جوں روز ے ایک ایک کر کے کم ہو رہے تھے اُن کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ جس قدر انھیں پڑھنا چاہیے تھا' وہ پڑھ نہیں پا رہے تھے اور بعض روز تو یوں ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں رات بھر تلاوت کرتے رہتے تھے مگر جو ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھتے تو خود کو کوسنے اور شیطان مردود کو پھٹکارنا شروع کر دیتے کہ آخر تلاوت کرتے کرتے وہ کہاں چلے جاتے تھے۔

تو یوں تھا کہ آج بھی وہ کہیں اور تھے۔

رات تراویح سے لوٹے تو یہی کوئی گھنٹا پون گھنٹا ہی کمر سیدھی کر پائے ہوں گے کہ انھیں لگا جیسے کوئی روئی جیسے ملائم ہاتھوں سے اُن کے پاؤں کے تلوے سہلا رہا ہو۔ انھیں مزا آ رہا تھا مگر مار کر پڑے رہے حتیٰ کہ تراویح میں مسلسل کھڑے رہنے سے ٹانگوں میں جمع ہو کر جم جانے والا خون نرم و گداز لمس کی لطیف حرارت سے پھر رواں ہو گیا۔ ایسے میں ہی شاید دائیں پاؤں کے تلوے کی عین ڈھلوان میں' وہاں جہاں پوست قدرے زیادہ ڈھیلا پڑ جانے کی

وجہ سے سہولت سے چنکی میں آجاتا ہے' چنکی میں لا کر مسل دیا گیا۔ چنکی میں آنے والے پوست سے لگے گوشت نے لمحہ بھر کے اندر اندر ایک میٹھے درد کو پورے بدن میں جھونک دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر اُٹھے اور ابھی نظر کا چشمہ تلاش نہ کر پائے تھے کہ ایک کھنک سی فضا میں تیر گئی۔ اُن کے سنبھلتے سنبھلتے سارا کمرا گہری خاموشی اور اکیلے پن کے احساس سے گونج رہا تھا۔

کمرے میں مدھم روشنی والا بلب' فینسی شیڈ کے اندر سے اُن کے بستر سے قدرے دور' دبیز قالین پر ایک دائرے میں روشنی پھینک رہا تھا۔ وہ کچھ بھی سوچے بغیر بٹر بٹر اس دائرے کو بہت دیر تکتے رہے حتیٰ کہ خواب میں بدن کا حصہ ہو جانے والا لطیف احساس خود بہ خود معدوم ہو گیا۔ اب انھیں اس ماہ مبارکہ کی پاکیزہ ساعتوں کے یوں ہی گزر جانے کا احساس تڑپا رہا تھا لہٰذا اُٹھے اور سیدھے واش روم میں گھس گئے۔

وضو تازہ کرنے کے بعد وہ تب سے پڑھنے بیٹھے تھے' اور سحری کے لیے جگانے والے سرکاری سائرن کی دوسری لمبی گھوں پر وہ بوکھلا کر سیدھے ہو گئے تھے۔ یہ بوکھلاہٹ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ گود میں پڑا ہوا قرآن پھسلنے لگا تھا۔ انھوں نے فوراً اُسے تھام لیا۔ ہڑ بڑاہٹ کچھ کم ہوئی تو اس نشانی کو تلاش کیا جہاں سے انھوں نے تلاوت کا آغاز کیا تھا۔ پھر تیز تیز ورق اُلٹتے الٹتے وہاں پہنچے جہاں تک' وہ اپنی دانست میں پڑھ چکے تھے۔

''ہائیں' بس اتنا ہی''

یہ انھوں نے قدرے اُونچی آواز میں کہا تھا اور ابھی تک فضا میں اُن کی بات ٹھہری ہوئی تھی کہ انھوں نے قرآن پاک کو دونوں طرف سے اور وسط میں بار بار بوسے دینے اور دائیں بائیں آنکھوں سے لگانے کے بعد چھاتی سے یوں بھینچ لیا جیسے فضیلت بھینچ لیا کرتی تھی۔

جب اُس کی ڈولی اُٹھی تھی تو فضیلت جان کو سولہوں لگا تھا۔ اُلہڑ اتنی کہ ایڑھیاں زمین پر ٹکتی نہ تھیں۔ قد نکلتا ہوا' رنگ کھلتا ہوا اور آوازیوں کہ آدمی سنے تو مست ہو جائے۔ جب وہ آئی تھی تو اس کا نام فضیلاں تھا اور اسے بہت ساری باتوں کی سمجھ بھی نہ تھی۔ جیجو کمہار کی بے ماں بیٹی، جو باپ کے ساتھ مٹی ڈھوتے، اسے گوندھتے، صحنکیں، گھڑے، ہنھل، چھونیاں،

www.urduchannel.in

کوزے، چلمیں اور ہویچے چاک پر چڑھاتے اور ان کی صورتیں بناتے ہوئے خود ایک بھولی بھالی صورت میں ڈھل گئی تھی کہ انھی نظر ہٹتی نہ تھی۔ جیجو خود بھی اسے دیکھتا تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ فضیلاں کے پیدا ہونے اور فضیلاں کی ماں کے مرنے کا واقعہ ایک ساتھ ہوا تھا۔ تب سے اب تک وہ جیجو کے لیے امتحان تھی۔ اور جب اس کا امتحان اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو خدا نے اس کی مشکل خود ہی آسان کر دی۔

یہ مشکل یوں آسان ہوئی تھی کہ فضل جُو بھی اُس کے گھر کے پھیرے لگانے لگا تھا۔

فضل جُو' جو ابھی خاکوٹ کے پرائمری اسکول میں ماسٹر نہیں لگا تھا' دوسرے نوجوانوں کی طرح بلاسبب کئی کئی بار منّی کے تباخ اور صراحیاں خرید چکا تھا۔ وہ اس کے گھر کے چکر کیوں لگا رہا تھا؟ جیجو بہت جلد سمجھ گیا تھا اور یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ یہاں سے جو کچھ خرید لے جاتا تھا' گھر نہ لے جاتا ہوگا۔ اگر لے گیا ہوتا تو پیش امام صاحب' اور بی بی صاحبہ کو ضرور کھٹک جاتا۔ تاہم جیجو بے بس تھا اور اتنا کم حیثیت کہ کوئی خدشہ یا کوئی شکایت منہ پر لانے کا سوچتا بھی تو اس کی کمر کے کپڑے گیلے ہو جاتے تھے۔

واقعات کے اسی تسلسل میں' جب جیجو مایوسی کی اس انتہا کو پہنچ گیا تھا جس میں خود سے خدشہ ہونے لگتا ہے کہ اس روگ سے تنگ آ کر کہیں اپنی جان کا نقصان ہی نہ کر بیٹھے' ایک ایسا واقعہ ہوا کہ مایوسی اس کے بدن سے خود بہ خود نچڑ گئی۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ فضل جو گاؤں کے دوسرے لونڈوں سے اُلجھ پڑا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور جیجو کی آوی کے چکر لگائے۔ یہ اکیلا تھا اور وہ چار' لہٰذا انھوں نے فضل جُو کی ہڈیاں کوٹ کر رکھ دی تھیں۔ یہ واقعہ اگرچہ خوشگوار نہ تھا مگر اس ایک واقعے نے کل تک گاؤں بھر کے دوسرے لونڈوں جیسا نظر آنے والے فضل جُو کو ان سب سے مختلف ہو کر دیا تھا جو اس کی بیٹی فضیلاں پر شرمناک نظریں گاڑنے اور لپ لپ رالیں ٹپکانے والے تھے۔

پیش امام صاحب جتنی بار مسجد جاتے تھے' فضل جُو لگ بھگ اتنی ہی بار بہانے بہانے سے جیجو کے گھر کے پھیرے لگا آتا۔ فضل جو کا باپ گاؤں کی مسجد میں پیش امام تھا اور جیجو

کمہار ماشکی۔ جیجو مسجد کا پانی تو باقاعدگی سے بھرتا تھا مگر نمازی وہ عید بقرعید والا تھا کہ اس بہانے اسے کپڑوں کا نیا جوڑا پہننے کو مل جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا: نئے کپڑے جسم پر نماز کے بعد ہی حلال ہوتے اور زیادہ عرصے تک چلتے تھے۔ کپڑوں کے نئے جوڑے میں برکت کی نیت سے وہ مسجد کے اندر جا کر ماتھا ٹیک آتا مگر پوری یکسوئی سے نماز اس لیے نہ پڑھ پاتا کہ رکوع میں جاتے ہوئے یا پھر سجدہ کرتے ہوئے کپڑوں کا نیا پن اسے اپنی طرف متوجہ رکھتا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے نکلتے ہی اسے فکر لاحق ہو جاتی کہ سجدہ کرتے اور رکوع میں بیٹھتے ہوئے اس کے کپڑے گھٹنوں تلے آ کر مسک گئے ہوں گے۔ وہ تسلی کرنے کے لیے راہ میں کئی بار جھک کر انھیں دیکھتا' ہاتھوں میں تان کر اور پھٹک کر جانچتا۔ ایسا کرنے میں وہ اس قدر مگن ہو جاتا کہ اکثر راہ گیروں سے ٹکرا جاتا۔ ایسے میں اسے تو بہت فجالت کا سامنا کرنا پڑتا جب کوئی بڑی عمر کی خاتون اس پر کالیوں کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔

گاؤں کی دوسری روایات کی طرح کمہار ہونے کی حیثیت سے ماشکی کا کام بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ نمازیوں کی خدمت کا جذبہ اس کے اندر شاید اس لیے پیدا نہ ہو سکا کہ مسجد کا حوض بھرتے بھرتے اس کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ جب بھی اس کے کپڑے پھٹتے تھے' یا تو کمر سے پھٹتے' جہاں وہ مشک ٹکایا کرتا یا پھر عین گھٹنوں کے اوپر سے۔ اسے ہر بار شک ہوتا کہ پہلے روز سجدہ کرتے وقت گھٹنوں تلے آ کر کپڑا زمین سے رگڑ کھا کر پتلا ہو گیا ہوگا اور چھاگنی بن جانے والا کپڑا تو ایک روز پھٹ ہی جایا کرتا ہے۔ ایسے میں وہ خلوص دل سے تمنا کرتا کہ کاش وہ ماشکی نہ ہوتا اور صرف کمہار ہوتا مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی حماقت پر رونا آ جاتا کہ بھلا کیسے ممکن تھا: ایک آدمی کمہار تو ہو اور ماشکی نہ ہو؟

کمہار ہو کر مسجد کا ماشکی ہونا اسے وراثت میں ملا تھا۔ اس کا باپ' بہت پہلے شدید سردیوں میں' ابھی تاروں کی چمک مدہم نہیں ہوئی تھی اور شیدے بانگی نے فجر کی اذان بھی نہیں دی تھی' پانی بھر کر لاتے ہوئے عین مسجد کی پرلی نکر کے پاس' ٹھوکر کھا کر منھ کے بل گر گیا۔ یوں کہ چمڑے کی مشک کے منھ پر مضبوطی سے جما اُس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا' اور گڑ گڑ کرتا پانی نکل کر

www.urduchannel.in

اسے پوری طرح بھگو گیا تھا۔ اُسے گھٹنے پر چوٹ آئی' چوٹ اگرچہ زیادہ نہ تھی مگر کسی پتھر کی نوک پر پڑنے سے گھٹنے میں اتنی فوری اور شدید تکلیف ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں کے آگے تر مرے ناچ گئے تھے۔ جب تک اس درد کی شدت مدھم ہوئی' مشک کا یخ پانی اسے پوری طرح بھگو چکا تھا۔ گھر پہنچا تو وہ ٹھرٹر ٹھرٹر کر رہا تھا۔ پھر اسے تپ چڑھا اور اس تپ نے اسے اتنی ہی مہلت دی کہ مشک بیٹے کو تھما دیتا۔ بیٹے کی مسیں ابھی پوری طرح بھیگی نہ تھیں کہ بھیگا ہوا باپ ٹھٹھر کر مر گیا۔ اسے مشک سے نفرت ہو گئی ..... مگر وہ اس نفرت کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور تھا۔

جیجو اپنے مرحوم باپ کی طرح وضو خانے سے ملحق حوض کو پانی سے بھرتا رہتا۔ حوض ہر نماز کے بعد خالی ہو جاتا تھا۔ اسے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا جو اس کے گمان میں زیادہ پانی خرچ کرتے تھے۔ ان میں سے جازو جولاہے' فیقے مستری اور میر شفیع کو وہ مسجد سے واپس آتے ہوئے ہر بار اس حال میں دیکھا کرتا کہ ان کی قمیضوں کے دامن' داڑھیاں یا پھر شلواریں گھٹنوں تک تر نظر آتی تھیں۔ سودے لُون کے بارے میں تو گاؤں بھر میں لطیفہ مشہور تھا کہ اسے اپنا ایک ایک عضو بھگونے کے لیے الگ سے بھرا ہوا پانی کا لوٹا چاہیے ہوتا ہے۔

جیجو جب بھی خالی مشکیزہ کندھے پر جما کر سائیں سوجھے کی چٹی قبر کے پیچھے سے ہوتا پہاڑی کے مُنڈھ سے بَل کھا کر گزرتے نیلے پانی تک پہنچتا تو اس کے پاؤں کے پنجے ڈھلوان میں مسلسل اُترنے کی وجہ سے اُوپر اُٹھنا بھول چکے ہوتے تھے۔ اسے وہاں سے مشکیزہ بھرنا ہوتا تھا۔ وہاں پتھروں پر آگے ہی آگے پھچھلتی پھسلتی چلے جانے والی اُتھلے پانی والی یہ ندی پیالہ بن کر لمحہ بھر کے لیے پانی ٹھہرا کر آئینہ بنا لیتی تھی۔

وہ مشکیزہ بھر کر اس کا منہ مٹھی میں دبا لیتا اور شیشہ بنے پانی میں خاکوٹ کے مکانوں کے عکس دیکھتا تو اس کا دِل بیٹھ جاتا تھا۔ ایسے میں جھک کر کندھے پر مشکیزے کو اُٹھانا اور بھی مشکل ہو جاتا۔ تاہم وہ بوجھل دِل کے ساتھ اُوپر کو چل دیتا تھا۔ مسجد تک پہنچتے پہنچتے اسے سودے لُون سے جازو جولاہے تک جو بھی یاد آتا اس کی دِل ہی دِل میں ماں بہن ایک کرتا جاتا۔ تاہم وہ واقعہ جس نے اس کے رویے کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا' وہ فضل جُو کا گاؤں کے دوسرے لونڈوں

سے مار کھانا تھا۔ اب وہ اوپر سے نیچے پانی تک جس طرح بھاگتا ہوا جاتا تھا اور جیسے پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اُٹھا کر پنجوں کے بَل اُچھلتا کودتا اوپر پہنچتا تھا' اُس پر سائیں سوجھے کی چٹی قبر ہر بار اسے حیرت سے دیکھنے لگتی تھی۔

بُری طرح پٹ کر زخمی ہونے والے فضل جُو کو جب لوگوں نے اُس کے گھر پہنچایا تو اس کی ماں' جو بچیوں کو قرآن پڑھانے کی نسبت سے گاؤں بھر میں محترم تھیں اور سب انھیں بی بی صاحب کہتے تھے' پہلے تو بیٹے کی حالت دیکھ کر چکرا کر گریں' اور جوں ہی ہوش آیا' چھاتی پیٹ پیٹ کر اپنے بچے پر یہ ظلم ڈھانے والوں کو کوسنے لگیں۔ پیش امام صاحب عصر کی نماز کے بعد مسجد گئے تو اپنے مُرشد کے ملفوظات کی کتاب پڑھنے کے لیے وہیں حجرے میں بیٹھ گئے تھے۔ اب جو خلافِ معمول اپنی بی بی کی کوسنے اٹھاتی آواز سنی تو ہڑ بڑا کر حجرے سے باہر نکلے اور مسجد کے دروازے سے متصل اپنے گھر کے دروازے پر جمع ہجوم کو چیرتے اندر گھس گئے۔ لوگوں نے اتنے قلیل عرصے میں جو ایسے اشارے کر دیے تھے جو بیٹے کی حالت دیکھ کر اور بی بی کے بین سن کر انھیں سارا معاملہ سمجھا گئے تھے۔ تاہم اس لمحے جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں کھڑے تھے انھیں نہ تو زخمی بیٹا نظر آ رہا تھا نہ پڑوسنوں کے درمیان کھڑی چھاتی کوٹتی اور گالیاں بکتی بی بی کہ وہ تو اپنی اس نیک نامی اور عزت کو خاک میں ملتا دیکھ رہے تھے جو عمر بھر کی ریاضت کا حاصل تھی۔ انھوں نے چھاتی کو وہاں زور سے دبایا جہاں انھیں بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا لہرانے لگا۔ اس خدشے کے باعث کہ کہیں چکرا کر وہ گر ہی نہ جائیں، وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ بی بی صاحب نے پیش امام کو یوں زمین پر بیٹھتے دیکھا تو ان کی آواز حلقوم ہی میں ڈوب گئی تھی۔

شام کی نماز سے پہلے پہلے وہ ہوش میں آ گئے' مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ مسجد جائیں۔ تاہم انھوں نے یہ نماز قضا نہیں ہونے دی۔ اور جب وہ رو رو کر اپنے ان گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے جو ان کی یادداشت سے باہر پڑے تھے اور جن کی سزا انھیں اس رُسوائی کی صورت مل رہی تھی تو آنسوؤں سے داڑھی بھیگ گئی تھی۔ وہ بہت دیر بعد مصلے سے اُٹھے'

www.urduchannel.in

زخمی فضل جُو کا ہاتھ تھاما' یوں زور سے جھٹکا دے کر اُسے چار پائی سے اُتارا' کہ اگر وہ نہ اُترتا تو ہو سکتا تھا اُس کا بازو ہی کندھے سے اُتر جاتا۔ بی بی صاحبہ نے یہ دیکھا تو بھاگتے ہوئے بیچ میں آئیں۔ پیش امام صاحب نے اسے دوسرے ہاتھ سے پرے دھکیل دیا۔ وہ فضل جُو کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔ گاؤں والے ایک بار پھر بی بی صاحبہ کی چیخیں سن رہے تھے۔

جیجو کے لیے اَن ہونی ہو گئی تھی۔ پیش امام صاحب نے کچھ نام لیے اور انھیں فوراً بلانے کو کہا۔ جیجو سب کو بلا لایا حالاں کہ یہ سارے وُہ لوگ تھے' جن کی داڑھیاں' دامن یا گیلی شلواریں ہمیشہ اسے جی ہی جی میں مغلظات بکنے پر مجبور کیا کرتی تھیں۔ مگر جب وہ ان سب کو آوی کے پاس اَپنی ٹوٹی ہوئی ان دو چار پائیوں پر بیٹھا دیکھ رہا تھا جن کے علاوہ اس کے گھر بیٹھنے کو کچھ تھا ہی نہیں' تو یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے نور دھارے نے اجال رکھے تھے۔ پیش امام سمیت یہ سارے لوگ اُسے آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے لگ رہے تھے۔

لذّت کہاں تھی؟

ماسٹر فضل جُو اب مڑ کر فضیلت کے بارے میں سوچتے تھے تو انھیں یوں لگتا تھا جیسے وہ تو ان کے لیے آسمان سے اُتری تھی' پنکھ لگا کر۔ وہاں جہاں جیجو کی آوی تھی۔ گاؤں کے لڑکوں سے پٹنا' ماں کا چھاتی کوٹ ڈالنا' ابا کا چکرا کر گرنا اور پھر گاؤں والوں کا جیجو چاچے کی آوی پر اکٹھے ہو کر اس کا نکاح کر دینا بس ایک بہانہ اور وسیلہ تھا۔

جب وہ چھاتی سے قرآن لگائے فضیلت کو سوچنے لگتے تو ڈھیروں وقت تیزی سے معدوم ہو جاتا تھا۔ جتنا وقت انہوں نے فضیلت کو سوچتے گزار دیا تھا' اتنا تو وہ ان کے پاس رہی بھی نہیں تھی۔ جس طرح فضیلت کو جنم دیتے ہوئے اس کی ماں مر گئی تھی بالکل اسی طرح' اَپنی شادی کے لگ بھگ چوتھے سال' جب کہ ابھی وہ محض انیس سال کی تھی' ماسٹر فضل جُو کے بیٹے کو جنم دیتے ہوئے وہ خود بھی دم توڑ گئی تھی۔ ان چار برسوں کی رفاقت انھوں نے کھینچ تان کر ساری عمر پر پھیلا لی تھی۔ چپکے سے چلے جانے والی' پنجوں کے بل چل کر آجاتی تھی اور سارے میں اُجالا پھیل جاتا تھا۔

''فضیلت ادھر آؤ تمھیں پڑھنا سکھا دوں۔''

وہ اُسے پاس بلاتے' قرآنی قاعدہ کھول کر پہلے حرف پر اُنگلی رکھتے اور اس کی بھولی صورت دیکھ کر'' آ'' کی آواز نکالنے کو کہتے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

'' یہ کیا پڑھنا ہوا جی' اس طرح تو میں ابا کے کہنے پر شیدو بانو کی مرغیاں گھیرا کرتی تھی ... آ' آ' آ''

فضیلت اتنے بھولپن سے یہ کہتی تھی کہ فضل جُو کی بھی ہنسی چھوٹ جاتی۔

وہ فوراً ہی مچلنے لگتی کہ اسے اسی طرح پڑھنا سکھایا جائے جس طرح خود لہک لہک کر ماسٹر جی تلاوت کرتے تھے۔ وہ بھاگ کر جاتی اور کارنس سے قرآن پاک اُٹھا لاتی۔ محبت سے اس کا غلاف الگ کرتی۔ اسے دائیں اور بائیں آنکھ سے لگا کر چومتی اور دونوں بازوؤں میں یوں بھینچ لیتی تھی جیسے وہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو اپنے سینے میں اُتار لینا چاہتی ہو۔

ماسٹر فضل جُو کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی اس خواہش کو کس طرح پورا کرے۔ وہ شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی لفظوں کو پوری صحت کے ساتھ اور صحیح مخرج سے ادا کرنے پر قادر نہ تھی۔ بعض اوقات تو وہ سبق دہرانے میں اتنی شدید غلطیاں کر جاتی کہ وہ ''نعوذ باللہ' نعوذ باللہ'' کا ورد کرنے لگتے تھے۔ انھیں ساری عمر افسوس رہا کہ وہ اسے نہ تو ڈھنگ سے نماز پڑھنا سکھا پائے تھے نہ قرآن۔ مگر جس طرح وہ سینے سے قرآن لگا کر لہک لہک کر گاتی رہتی اس کی بابت سوچتے تو پورے بدن میں ایک عجب طرح کا کیف اور مستی بھر جاتی تھی:

''اُٹھل کھڑی وچ قرآن
آسوں پاسوں' تو رحمان
لوبے دیاں کنجیاں' ترا اے دے تالے
یا نبی تُساں کرماں والے
کول میرے نہیں کوئی تھوڑ
اللہ والے مینوں تیری لوڑ

www.urduchannel.in

یا نبی دی چڑھی سواری
چواں کُنھاں دی خبرداری'

اپنے پاک نبی کی اس خبرداری میں وہ نہال رہتی تھی۔ تاہم 'آیت' اور 'کرسی' کے عام سے الفاظ بھی وہ صحیح طور پر ادا کرنے پر قادر نہ تھی۔ 'آیت' اور 'ال' کو ملا کر پڑھتی تو 'اَتل' ہو جاتا اور 'کرسی' کی بہ جائے وہ 'کھرسی' کہتی۔ ماسٹر صاحب سمجھاتے:

'کھرسی نہیں کرسی'

اور وہ سوچے سمجھے بغیر انتہائی عقیدت اور محبت سے دہراتی:

'کھرسی نہیں کھرسی'

جتنی بار اس کی تصحیح کی جاتی وہ اتنی بار ویسے ہی پڑھ دیتی تھی جیسا کہ کوئی لفظ شروع سے اس کی زبان پر چڑھا ہوا ہوتا۔ تاہم جب وہ خود تلاوت کرنے لگتے تو اصرار کرتی کہ آواز ذرا بلند رکھی جائے۔ وہ لپٹ لپٹا کر پاس ہی بیٹھ جاتی اور ہر آیت میں حروف کی ادائی کے دوران جس طرح آواز اوپر نیچے ہوتی اس کی سانسیں بھی پھولنا شروع ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ وہ ہچکیاں باندھ کر رونے لگتی تھی۔ نماز کے لیے وہ اماں بی بی صاحبہ کی طرح دوپٹا خوب اچھی طرح لپیٹ لیتی تھی۔ پانچوں وقت مصلے پر ضرور کھڑا ہوتی۔ ماسٹر صاحب یہ سوچ کر کہ وہ نماز میں کیا پڑھتی ہوگی اپنے تئیں بہت شرماتے رہتے مگر نماز میں اس کی حضوری کا عالم دیکھتے تو خود پر شرماتے۔ انھیں بہت جلد احساس ہو گیا تھا کہ قرآن پڑھنے کا معاملہ ہو یا نماز روزے کا نادُرست ہو کر بھی وہ سب کچھ اتنے یقین' محبت اور اہتمام سے کرتی تھی کہ انھیں اس کے مقابلے میں اپنا ایمان اور علم دونوں ہیچ لگنے لگتے۔ وہ مرگئی تو بھی ماسٹر صاحب اس کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھتے رہے۔ اسے خوابوں میں بلاتے اور اس سے اس خالص پن کا سبق لیتے جو اس کے وجود سے نور بن بن کر چھن رہا تھا۔

مگر' کچھ دنوں سے یہی نور اُن کی آنکھوں میں چبھتا اور سینے میں چھید کرتا تھا۔ شاید اب ماسٹر فضل جو کچھ زیادہ ہی زودحس ہو گئے تھے۔ انھیں فضیلت کا یوں بار بار آنا ستانے کے

مترادف دکھنے لگا تھا۔ تاہم اس کا تو وہی معمول تھا جو ہمیشہ سے رہا تھا۔ رات کے کسی پہر چلے آنے والا' پنجوں کے بل اور چپکے سے وجود میں سرایت کر جانے والا... اس معمول میں کبھی رخنہ نہیں آیا تھا۔ اور شاید اس سے کم پر فضیلت خود بھی راضی نہ تھی۔

ماسٹر صاحب نے خوب احتیاط سے ان زیادہ ستائے جانے والے دنوں کا حساب لگایا تو یہ اتنے ہی بنتے تھے جتنے دنوں سے وہ اپنے بیٹے کے ہاں اُٹھ آئے تھے۔ اب پیچھے پلٹ کر دیکھتے تھے تو بیٹے کے ہاں اُٹھ آنا انھیں یوں لگنے لگتا جیسے زندگی یکدم رس سے خالی ہو گئی ہو۔ ایک خوب صورت سنہرے سیب جیسی زندگی' جو ماسٹر صاحب کی دسترس میں تھی' وہ اس پر اپنے دانت گاڑھ سکتے تھے مگر اس میں سے لذّت نکلتی ہی نہ تھی۔ ہر بار منھ پھوگ سے بھر جاتا تھا۔

زمین کے چلنے سے پہلے

جو زندگی وہ تج کر یہاں آگئے تھے اُس کے آخری حصے میں ان کی روح کے لیے اگرچہ لذّت کے ہلکورے باقی تھے مگر بدن کے ضعف نے اس میں سو طرح کے رخنے ڈال دیے تھے۔ اُن کی سانسیں ناہموار رہتیں اور جوڑوں میں درد بھی وقفے وقفے سے جاگ اُٹھتا۔ ایسے میں ماسٹر فضل جو نے وہ جو عمر بھر کی ریاضت سے دین اور دنیا میں توازن کا ایک نظام قائم کر لیا تھا' اس میں انھیں سو طرح کی خرابیاں نظر آنے لگتیں۔ ان کی زندگی کرنے کا وتیرہ ان کے بہشتی باپ سے بالکل مختلف تھا۔ گزرے ہوئے زمانے کے ایک پیش امام کی دنیا ہو بھی کتنی سکتی تھی۔ ڈیڑھ دو سو گھروں پر مشتمل چھوٹی سی بستی خاکوٹ میں زندگی تھی بھی بہت سادہ اور اکہری مگر پیش امام اس سے بھی دست کش رہتے تھے۔ مسجد' اس کا حجرہ یا پھر ایک کمرے اور پسار والا گھر۔ مسجد سے ملحقہ صحن سے گاؤں کے بچوں اور ان کے گھر سے بچیوں کے سبق دہرانے کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں یوں' جیسے سپارے نہ پڑھے جا رہے ہوں' بہتا پانی پتھروں سے پھسلتا' گنگنا کر گزرتے چلا جاتا ہو۔

بی بی صاحبہ کی زندگی کی ضروریات تو پیش امام کی ضرورتوں سے بھی کم تھیں۔ چولھا بھی کبھی کبھار ہی جلنے پاتا تھا کہ گاؤں والوں نے اپنے آپ ہی دن باندھ لیے تھے۔ کسی نے

www.urduchannel.in

دِن کے اُجالے میں پیش اِمام اور بی بی صاحبہ کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ فضل جُو کو کبھی ماں باپ کا باہم صلاح کرنا یا کسی بات پر کُھل کر قہقہہ لگانا یاد نہ آتا تھا۔ بعد میں جب بھی انھوں نے اپنے باپ کو ذہن میں لانا چاہا اُن کے دھیان میں مسجد سلکھنی کا' روئی کے گالوں جیسی داڑھی والا پیش اِمام آجاتا' جس کا سر ہمیشہ کروشیئے والی سفید ٹوپی اور بُمل بندھے چارخانوں والے رومال سے ڈھکا رہتا تھا۔

پیش امام صاحب گھر میں داخل ہونے کے بعد جوں جوں پیار کی طرف بڑھتے توں توں اُن کی گردن جھکتی چلی جاتی۔ اس اثنا میں اُن کی ماں کا گھونگھٹ بھی نکلنے لگتا۔ وہ اَپنی انگلیاں ماتھے کے وسط سے اوپر' وہاں سے چادر کو گرفت میں لے کر لمبا گھونگھٹ نکال دیتی تھیں' جہاں سے چاندی جیسے بالوں کے درمیان' بالکل سیدھ میں مانگ نکلی ہوتی تھی۔ اُن کا گھونگھٹ اِتنا لمبا ہوتا کہ وہ اس لمحے فضل جُو کی ماں یا اس کے باپ کی بیوی نہ رہتی تھی بی بی صاحبہ ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں فضل جُو کی سماعتوں میں پیار کے اندر سے نیلے پانی کے بہاؤ کی رچی بسی گنگناہٹ خود سے جاری ہو جاتی تھی۔

فضل جُو میں حوصلہ تھا نہ ہمت کہ وہ پیش امام صاحب جیسی زندگی کو اپنے لیے اختیار کرتے۔ محکمہ تعلیم میں نوکری مل گئی تھی' ہر طرف سے احترام ملا۔ جسے دیکھو' ماسٹر صاحب' ماسٹر صاحب' کہتے تھکتا نہ تھا۔ لوگ سلام کرنے میں پہل کرتے۔ جہاں وہ تھے وہاں ابھی اُستاد یا صاحب علم ہونا واقعی لائق تکریم تھا۔ جب ہر طرف سے اتنی عزت ملی تو چھاتی پھولنے اور شملہ تننے لگا۔ تاہم اس سب کو وہ اس کی عطا سمجھتے رہے تھے جس کے لیے اُن کے اَبا جی نے دنیا تج دِی تھی۔

جب تک وہ اَپنی زِندگی میں رُجھے رہے' سب کچھ ٹھیک ٹھیک چلتا رہا۔ مگر ریٹائرمنٹ کے بعد' اور اَپنی عمر سے مات کھا کر' جب سے وہ بیٹے کے ہاں اُٹھ آئے تھے اُن کے اَندر بہت توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ انھیں جس خدا سے معاملہ رہا تھا وہ اس جدید طرز کے ٹاور کے کسی اور حصے میں ہو تو ہو وہاں نہیں تھا جہاں اُن کا بیٹا اور بہو رہتے تھے۔ شاید یہی سبب ہوگا کہ اپنے کمرے

میں انھیں اسے پاس بلانے، ربطِ خاص قائم کرنے اور اس کا ہو جانے میں بہت جتن کرنے پڑتے تھے۔ اگرچہ اس گھر میں اشیاء نے بہت جگہ گھیر رکھی تھی تاہم یہ خلوص سے جتن کرتے تھے تو وہ راہ بناتا چلا آتا تھا۔

اس رات کہ' جس کے معدوم ہو چکنے کے بعد بھونچال کو چپکے سے آکر سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دینا تھا' عین اسی رات کو فضیلت نے آکر ماسٹر فضل جُو کو بہت ستایا تھا۔ وہ پڑھتے ہوئے بار بار اونگھتے اور اسی اونگھ جھپکی میں لمبا غوطہ کھا جاتے' یوں جیسے پینگ ہلارے لیتے لیتے ایک لمبی جست لے اور بادلوں میں اُتر کر واپس آنا بھول جائے۔ خواب کے اس لمبے ہلارے نے جن بادلوں میں انھیں اُتارا تھا' وہاں فضیلت تھی' جو بار بار پوچھے جاتی تھی:

''ماسٹر جی آپ ان کے لیے کیوں پڑھتے ہیں جو خود پڑھ سکتے ہیں' مگر پڑھنا نہیں چاہتے؟''

ماسٹر جی چپ رہے تو وہ تن کر اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی:

''دیکھیں جی' میں جو ہوں آپ کے سامنے' بالکل کوری' ایک بھی مبارک لفظ ڈھنگ سے نہ پڑھ سکنے والی' لیکن ایک ایک لفظ کے لیے اپنے پورے وجود کو سماعت بنا لینے والی آپ میرے لیے کیوں نہیں پڑھتے جی؟''

انھیں کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئے اور پورے بدن کو جھلا جھلا کر پڑھنے لگے۔ غالباً وہ تیسرا یا چوتھا جھلارا ہوگا کہ ایک سرگوشی کی سنسناہٹ پورے کمرے میں تھرا گئی:

''کوئی نہیں سن رہا۔''

انھوں نے اس آیت پر انگلی رکھی جسے پڑھ رہے تھے اور کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ چپکے چپکے اور ٹھہر ٹھہر کر۔ یوں جیسے انھیں یقین ہو کہ وہاں کوئی تھا مگر اپنی ناراضی ظاہر کرنے کے لیے ان کی نظروں میں آنے سے بچ رہا تھا۔ تھک ہار کر ان کی نظریں پاک صحیفے پر سرنگوں اپنی شہادت کی انگلی پر آکر رک گئیں مگر زبان تالو کے ساتھ چمٹی رہی۔ انھوں نے قرآن پاک کو وہیں سرہانے پر کھلا رکھ دیا اور ٹانگیں سیدھی کر کے پلنگ سے لٹکانا چاہیں۔ ایک آدھ لمحہ اُس اینٹھن کو

www.urduchannel.in

جھٹکنے میں لگ گیا جو ایک ہی رخ بیٹھے بیٹھے ان کی ٹانگوں میں ہونے لگی تھی۔ تاہم جب ٹانگوں پر بوجھ ڈال کر کھڑے ہوئے تو وہ بہت جلد توازن برقرار رکھنے کے قابل ہو چکے تھے۔

انھوں نے کھڑے کھڑے فضا میں متحرک ان مقناطیسی لہروں کو محسوس کیا جو پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھیں۔ یہ لہریں اُن کے جسم پر یوں رینگنے لگیں جیسے چیونٹیاں رینگتی ہیں' جس سے ان کے بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اُن کے دِل پر بھی خون کا دباؤ بڑھ رہا تھا جس نے انھیں بوکھلا دیا۔ اس بوکھلاہٹ میں ان کے قدم دروازے کی سمت اٹھنے لگے۔ جب وہ دروازے کی طرف جا رہے تھے تو انھیں یوں لگا: جیسے عین ان کے عقب میں فضلیت بھی پنجوں کے بل چلی آتی تھی۔ وہ غصے میں دھونکنی کی طرح چلنے والی اس کی سانسوں کی آنچ بھی اپنی گردن پر محسوس کر رہے تھے:

''وہاں کوئی نہیں ہے۔''

انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہاں آواز نہیں' ایک سسکاری تھی۔ دِل بیٹھنے لگا تو دھیان بٹانے کے لیے آگے بڑھ کر دروازہ چوپٹ کر دیا۔

وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

لاؤنج کے خالی پن کو چیر کر ان کی نظریں اپنے بیٹے اور بہو کے بیڈ روم کے بند دروازے پر پڑیں۔ ایک عجب طرح کی بے پرواہی وہاں ٹھہری ہوئی تھی۔

دروازے میں کھڑے کھڑے جب اُن کے سوچنے کے لیے کچھ نہ رہا تو ماسٹر فضل جُو نے گردن موڑ موڑ کر کمرے میں دیکھنا بھی معطل کر دیا تھا۔ وہ جان چکے تھے کہ وہاں اب کسی کی خوشبو تھی نہ قہقہے' سرگوشیاں تھیں نہ لہجے کی وہ آنچ جو کب سے ان کی محسوسات کا حصہ تھی۔ وہاں فقط برہم اور اجنبی سی مقناطیسی لہریں تھیں۔ تقفل کے اسی عرصے میں انھیں یاد آیا کہ وہ بستر کے سرہانے قرآن کھلا چھوڑ آئے تھے:

''بیٹا قرآن یوں کھلا نہیں چھوڑتے' شیطان پڑھنے لگتا ہے۔''

یہ بی بی صاحبہ کی آواز تھی۔ نحیف سی آواز جو انھوں نے مُدّت بعد سنی تھی۔ وہ جانتے

تھے کہ شیطان کے قرآن پڑھ لینے والی بات محض اس لیے کی جاتی تھی کہ بچیاں قرآن پڑھنے کے بعد غلاف میں لپیٹ کر اور کارنس پر رکھ کر جایا کریں۔ تاہم بعد میں انھوں نے اس کا یہ مفہوم خود سے اخذ کر لیا تھا کہ مومنین کے لیے ہدایت بنتی آیات کو شیطان مردود کھلے قرآن سے اُچک کر ان میں سے اپنے مطلب کے معنی نکال کر اِدھر اُدھر پھیلا دیتا ہوگا: تب ہی تو پہلی عمر میں تواتر سے سنے گئے اس جملے کے سچا ہونے کا انھیں یقین سا ہو چلا تھا۔ انجانے خوف کے زیر اثر وہ بھاگتے ہوئے اپنے بیڈ تک پہنچے' سرہانے سے قرآن پاک کو اُٹھا کر تہ کرتے ہوئے کئی بار بوسے دیئے۔ اسے آنکھوں سے لگا کر سینے کے ساتھ چمٹایا اور دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب زمین اپنے آپ چل پڑی تھی۔

مایا در کی گرہیں کھولتا ہے۔

کہتے ہیں جب پیش امام صاحب' نے کچی لکیر پار کی تھی تو پیش امام نہیں تھے۔ وہ تو اُدھر پونچھ میں صاحب حیثیت آدمی تھے۔ ماں باپ نے لس جُو نام رکھا اور اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ وہ حضرت بل کے پاس سے گزرتے ہوئے بے ارادہ اندر داخل ہو گئے۔ دِل پر ایسا رُعب پڑا کہ کئی گھنٹے باہر نہ آ سکے۔ اسی بے خودی کے دورانیے میں انھیں کچی لکیر پھاند لینے کا حکم ہوا۔ انھوں نے سب کچھ سے ہاتھ جھٹکا' اور ادھر اٹھ آئے تھے۔ کچھ کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ ان کا جوان بھائی مار دیا گیا اور مارنے والے ان کے تعاقب میں تھے لہٰذا ادھر آنے کا حیلہ انھوں نے اپنی جان اور نسل بچانے کے لیے کیا تھا۔

لس جُو نے جان بچائی تھی مگر اس کی نسل کے قدموں تلے' اب جو زمین تھی' وہ اپنے آپ چل پڑی تھی۔

جب لس جُو پونچھ سے تتری کوٹ آئے تھے تو ان کا وجود ایک عجب طرح کے شدید احساس سے لرزتا رہتا تھا۔ یہاں ادھر کی خبریں آتی رہتی تھیں جو احساس کے عجب اور شدت میں اضافہ کرتی رہتیں۔ پوری طرح سمجھ میں نہ آنے والا یہ احساس انھیں کبھی تو ایک بار پھر کچی لکیر پار کرنے پر اکساتا اور کبھی اس سے دور پٹخ دیتا تھا۔ اس پراسرار احساس سے چھٹکارا

www.urduchannel.in

پانے کے لیے انھوں نے اپنا گھر کاندھے پر رکھ لیا اور پہاڑوں کے اندر بھٹکنے لگے۔ کبھی گڑمنڈہ' سدھن گلی' کامی منجہ اور حتہ تو کبھی پرس' جل اور چناری حتیٰ کہ وہاں سے خاکوٹ آ گئے جس نے انہیں اپنے اندر بسا لیا تھا۔ پہلی بار تتری میں رہائش اختیار کرنے کی مناسبت سے وہ ایک عرصہ تک لس جو تتری کہلاتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ مسجد سلکھنی کی پیش امامی ان کی زندگی کا وظیفہ ہو گئی جس نے ان کا اصل نام سب کے ذہنوں سے محو کر دیا تھا۔

جس روز بھونچال آیا تھا' اس روز دن ڈھلے تک سب یہ سمجھ رہے تھے کہ اسلام آباد کے پوش علاقے میں بس ایک ملٹی سٹوری ٹاور گرا تھا۔ وہی' جس کے چھٹے فلور پر ماسٹر فضل جو شیطان کی نظر کھلے ہوئے قرآن پر پڑنے کے خدشے سے اپنے بیڈ تک آئے تھے اور قرآن چھاتی سے چپٹا کر واپس دروازے کی چوکھٹ میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ عین اس وقت کہ جب بہت سارے کیمروں کو گواہ بنا کر حکومت کا سربراہ اس ٹاور کے ملبے پر چڑھ کر اعلان فرما رہا تھا کہ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ ادھر پہاڑوں پر کتنی بڑی قیامت ڈھے چکی تھی۔ وہاں زمین نے کئی پلٹے کھائے اور پہاڑوں نے بھُربھُرا ہو کر خاکوٹ کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ مسجد سلکھنی کے میناروں' پیش امام صاحب اور بی بی صاحبہ کی قبروں' جیجو کی اُجڑ چکی آوی اور اوپر سے نیچے کو دھیمے سروں میں بہنے والے نیلے پانی' اور اس کے مکینوں کی نارسائیوں اور معصومیت سمیت سب کچھ خاک کا رزق ہو چکا تھا۔ کہ اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

لگ بھگ یہ وہی وقت بنتا ہے' ملبے کے اوپر چڑھ کر تصویریں بنوانے والا' اور وہ بھی یوں جیسے کوئی شوباز شکاری پہلے سے مرے ہوئے شیر کو دیکھے اور اس کے بدن پر پاؤں رکھ کر لوگوں کے دلوں پر دھاک بٹھانے کے لیے تصویریں اتروانا شروع کر دے' ہاں' عین مین وہی وقت' جب اوپر سے کدال پڑنے' اور لوہا کاٹنے کی آوازیں آنے والے کے پروٹوکول میں کچھ وقت کے لیے معطل ہو گئی تھیں۔ تب سیمنٹ اور سریے کی کئی تہوں تلے ماسٹر فضل جو کو اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ بہت جلد زندگی کے اس احساس کو ان کی دیچی سے' ٹانگوں' پنڈلیوں اور کمر سے بازوؤں' گردن اور گدی سے اٹھنے والے درد نے پچھاڑ دیا۔ وہ بے بسی اور

درد سے جس قدر بلبلا سکتے تھے بلبلائے' روئے اور پھر سسکتے چلے گئے۔ مگر جب انھیں احساس ہوا کہ اُن کی چیخوں اور رونے دھونے کو سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا تو وہ یوں چپ ہو گئے جیسے ازل سے بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ تب انھیں اپنا بیٹا اور بہو ایک ساتھ یاد آئے۔ اپنے بہشتی ماں باپ کی طرح انھیں بھی انھوں نے آپس میں کم ہی صلاح کرتے یا کھل کھلا کر ہنستے دیکھا تھا۔ تاہم اس ایک وتیرے کی تاثیر دونوں کے ہاں بالکل مختلف اور متضاد ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں' جو اندر تھے ان کی آنکھوں کے سامنے والے دروازے کے پیچھے' یقیناً وہ ایک بیڈ پر ہوں گے مگر وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ مصروفیت کی تھکن نے انھیں دونوں کناروں پر ہی گرا دیا ہو گا؛ یوں کہ وہ پہلو بدل کر قریب بھی نہ ہو پائے ہوں گے۔ اس فاصلے کو انھوں نے ان کے بیڈ روم کے دروازے پر کھدا ہوا دیکھ لیا تھا۔ یہ جو آنے والا وقت اُن کی محسوسات پر دستک دینے لگتا تھا اس سے بچنے کے لیے انھوں نے اندازے لگانا بند کر دیے۔

ابتدا میں جو اندازے لگائے جا رہے تھے وہ سارے ہی غلط ہو چکے تھے۔ تتری کوٹ سے خاکوٹ تک پہاڑوں پر بستیاں لاشوں سے بھری پڑی تھیں اور انھیں بے گور و کفن پڑے اتنا وقت گزر چکا تھا کہ وہ تعفن چھوڑنے لگی تھیں۔ انھیں یا تو دفنانے والا کوئی نہ بچا تھا اور اگر کوئی بچ گیا تھا تو اپنوں کی اتنی لاشیں زمین میں دبا چکا تھا کہ اس کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ ادھر شہر کے وسط میں ڈھنے جانے والے ٹاور سے بھی لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔ ملبے میں سے گاہے گاہے زندہ لوگ بھی نکل آتے تھے۔ اور جب ایسا ہوتا تو متحرک اور ساکت تصویریں بنانے والے کیمروں کو اٹھائے میڈیا کے منتظر لوگ بھاگ بھاگ کر اس کی تصویریں اتارنے اور رپورٹیں نشر کرنے میں سبقت لے جانے میں مگن ہو جاتے۔ ایسے میں یوں لگتا تھا جیسے موت کے سناٹے سے زندگی کی ہمہمی نے یک لخت جنم لے لیا ہو۔ تاہم ابھی تک نہ تو ماسٹر فضل جو کو دریافت کیا جا سکا تھا اور نہ ہی ملبے کے ڈھیر میں دبی ہوئی ایک بیڈ کے دونوں کناروں پر پڑی ان کے بیٹے اور بہو کی لاشوں کو نکالا جا سکا تھا۔

ماسٹر فضل جو اس سارے عرصے میں درد سہے چلے جانے کے لائق ہو گئے۔ اسی

دوران میں انھیں یہ اِحساس بھی ہوا کہ قرآن پاک اُن کی چھاتی سے لگا ہوا تھا۔ تاریکی کی بے شمار تہوں کے باوجود انھوں نے چاہا کہ اُسے کھول کر پڑھیں۔ اُپنے بازوؤں پر زور لگا کر ایسا کرنا بھی چاہا مگر بازو جہاں تھے وہیں جمے رہے۔ ملبے نے چاروں طرف سے اُن کے بازوؤں کو جسم سمیت دبا رکھا تھا' یوں کہ وہ ذرا سی حرکت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تب انھیں ایک بار پھر ایک نحیف سی آواز سنائی دے گئی تھی: وہی شیطان سے چوکنا کرنے والی ماں کی آواز۔ انھوں نے بازوؤں کو کھولنے کے جتن ترک کر دیے۔

جب ٹھہرے ہوئے وقت اور تاریکی کو کاٹ ڈالنے کا کوئی بھی حیلہ ان کے ہاتھ نہ لگا تو انھوں نے اُپنی یادداشت پر زور ڈال کر کچھ آیات تلاوت کرنا چاہیں مگر ہوا یہ کہ وہ سورۃ زلزال کی اِبتدائی آیات کے بعد سورۃ والعصر کی اِنسان کو خسارے میں بتانے والی آیات پڑھ گئے تھے۔ انھوں نے پھر سے درست درست پڑھنا چاہا تو ایسا تشابہ لگا کہ کہیں سے کہیں نکل گئے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ اس پر وہ اتنا بوکھلائے کہ اُمید کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایسے میں انھیں اِحساس ہوا کہ وہاں تو سانس لینے کے لیے ہوا ہی نہیں تھی۔

اور جب ماسٹر فضل جُو نے اُپنے تئیں ملبے کے اَندر پھنسی ہوئی ہوا کو کھینچنے کے لیے آخری حیلہ کیا تو اُن کی پسلیاں چٹخنے لگیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سیمنٹ اور سریے کی تہیں کاٹ کر فضیلت وہاں پہنچ گئی تھی: سارے غصے کو تھوک کر' اور اُن ساری آوازوں کو ساتھ لے کر' جو ملبے میں دبنے والوں کے دُکھ سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ یہ آوازیں گنتی میں نہ آنے والے لوگوں کے سینوں سے اُبل اُبل کر ویسی ہی گنگناہٹ پیدا کر رہی تھیں جیسی ماسٹر فضل جُو کی سماعت میں خاکوٹ کے نیلا پانی نے بسا رکھی تھی۔ تب ماسٹر صاحب کو یوں لگا تھا کہ جیسے ان کے بازو تو ویسے ہی جکڑے ہوئے تھے مگر اُن کے حصار میں موجود' ایک مُدت سے خوابیدہ سارے مبارک اور روشن لفظ' خود بخود ان کی چھاتی کے اندر مقطر ہو رہے تھے۔ فضلیت نے آتے ہی اُپنے ہاتھوں کے ملائم لمس سے اُن کے وجود کی ساری گرہوں کو کھولنا اور سارے دَردوں کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

www.urduchannel.in

وہ اُپنی ہی دُھن میں مگن رہی' حتیٰ کہ اس کی ریاضت مستجاب ہوئی اور اسے اپنے سنگ آنے والی ساری آوازوں کے ساتھ ان کے وجود کے اَندر حلول کر جانے کا اذن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی زندگی کی لذت میں گندھا ہوا تازہ ہوا کا لطیف جھونکا ملبے میں گھس کر ان کے ڈھے جانے والے وجود کے اندر بہت گہرائی میں اتر گیا اب صرف وہی سانس نہ لیتے تھے' پورا ملبا سانس لیتا تھا۔

×××÷×××

www.urduchannel.in

کیس ہسٹری سے باہر قتل

سب ڈاکٹر ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بحث میں جتے ہوئے تھے سوائے ڈاکٹر نوشین کے' جس کے پورے بدن میں دوڑنے والی بے کلی اتنی شدت سے گونج رہی تھی کہ وہ بلانے والوں کو' ہیلو ہائے' سے آگے کچھ نہ کہہ پاتی تھی۔ اس نے قصداً اپنی اس کیفیت پر قابو پایا اور ایک نظر بیضوی میز کو گھیرے اپنے کولیگز پر ڈالی جو سرکتی' پھسلتی سامنے کینوس کی دیوار پر پہنچی اور وہیں ٹھہر گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہاں اس کے اپنی کیس ہسٹری کی سلائیڈز چل رہی تھیں۔

وہ مصروف عورت تھی' صبح پنڈی والی شاخ میں اور شام یہاں۔ اس کا شوہر بھی مصروف آدمی تھا جس نے اپنے ہنر اور فرض کو کمال نفاست اور عجب ہوشیاری سے سرمایہ کاری بنا ڈالا تھا۔ شروع شروع میں دونوں کی یہ بے پناہ مصروفیت کام کی لگن کی وجہ سے تھی پھر اس میں بہت سارے خواب شامل ہو گئے۔ دونوں ان خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے میں یوں الجھے کہ ایک دوسرے کے لیے جینے کا تصور ان کے ہاں سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ یہ بھول ہی گیا کہ ایک دوسرے کے لیے پریشان کیسے ہوا جاتا ہے' بے نتیجہ باتوں سے لطف کیسے کشید کیا جاتا ہے اور بلا سبب کیسے ہنسا جاتا ہے۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا نبیل۔ اس کی ایجوکیشن کا مرحلہ آیا تو اس وقت تک کوالٹی

ایجوکیشن کا ڈھنڈورا پٹ چکا تھا۔ اس نئی وبا کی اپنی ضروریات اور تقاضے تھے' جو دونوں کو پورے کرنا تھے اور جس نے انھیں اس قدر الجھایا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے فکری سے بات کرنے کو بھی ترس گئے' حتیٰ کہ یہ مصروفیت ان کے وجود میں اتر گئی۔ گھر بن گیا' خوب صورت اور بڑا' ویسا ہی جیسا وہ چاہتے تھے۔ کلینک بنا جو بعد ازاں کئی بستروں کے ہسپتال میں کنورٹ ہو گیا' اس کی ایک شاخ پنڈی میں بھی کھل گئی اور بیٹا پڑھنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔

شروع شروع میں نبیل سے فون پر بات ہو جاتی تھی' بعد میں وقفے پڑنے لگے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ رابطہ معطل ہو کر رہ گیا۔ جب اسے وہیں اپنی مرضی کی جاب اور لڑکی دونوں مل گئیں تو یہ سلسلہ بہت جلد موقوف ہو گیا۔ ادھر سے فون چلا جاتا تو کرنے کو کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ اگر ادھر سے کوئی کریدی جاتی' یا اس کی آواز سننے کو یوں ہی بات بڑھائی جاتی تو نبیل یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا کہ اس بارے میں وہ ای میل کر دے گا۔

اس کا میل باکس ہر روز رنگ رنگ کی میلز سے بھر جاتا تھا جن میں چند ہی اس کے اپنے پروفیشن سے متعلق ہوتیں۔ بیش تر کو ان وانٹڈ (unwanted) کے زمرہ میں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس نے شروع میں اپنے بیٹے کی ای میلز لینے کے لیے ہاٹ میل پر جا کر یہ اکاؤنٹ بنایا تھا' اور روز ہی اسے کھول کر دیکھتی تھی۔ اس پر اس نے بیٹے کی کچھ ای میلز وصول بھی کیں مگر جب یہ باکس زیادہ تر خالی کنستر کی طرح بجنے لگا تو اس نے اس پر اپنے شعبے سے متعلق الیکٹرانک جریدے منگوانے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی آلائشیں بھی آنے لگیں جنھیں وہ پہلے تجسس سے دیکھا کرتی مگر بعد میں دیکھے بغیر ہی ڈیلیٹ کر دیتی کہ ان میں دکھایا جانے والا ہر جسم اسے اپنے شوہر کے جسم کی طرح بے ہودہ اور پھسپھسا لگتا: جب کہ ہر عورت کا وجود بالآخر اس کے اپنے وجود کی طرح باسی ہو جاتا تھا۔

''جی ڈاکٹر نوشین۔''

ایک آواز نے براہ راست اسے مخاطب کر کے چونکا دیا تھا۔

یہ ڈاکٹر نعمان تھا' جس کے آتے ہی سب اپنی باتوں سے نکل آئے تھے اور اب تعظیم کے لیے اُٹھنا چاہتے تھے' مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو رکوع ہی سے لوٹ گئے۔

ڈاکٹر نوشین کو اپنے دھیان سے نکلنے اور سنبھلنے میں کچھ وقت لگا تاہم اس اثنا میں وہ اپنی سیٹ سے کھڑی ہو چکی اور اندازہ لگا چکی تھی کہ اسے کیس کی پریذنٹیشن کا کاشن دیا جا چکا تھا۔

یہ کیس ڈاکٹر نوشین نے بورڈ کو ریفر کیا تھا لہٰذا اس کا نام لے کر ڈاکٹر نعمان کا ''جی'' کہنا اس کے لیے اتنا غیر متوقع نہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید ڈاکٹر نعمان پوری طرح بیٹھ چکنے کے بعد' حسبِ عادت مسکرا کر اور سب کی طرف دیکھنے کے بعد ایسا کہتا تو تب تک وہ سنبھل چکی ہوتی اور یوں نہ بوکھلاتی۔ اس نے بہت جلد بھانپ لیا کہ اس کا ''جی'' کہہ کر فوراً ہی میٹنگ شروع کر دینے کا مطلب تھا کہ وہ بہت جلدی میں تھا۔

یہ جلدی دونوں کے وجود میں اتری ہوئی تھی مگر اس کیس کے بارے میں ڈاکٹر نوشین کا خیال تھا کہ یہ جلدی کا نہ تھا' پوری توجہ چاہتا تھا۔

اس اُمید پر کہ شاید آنے والے لمحات میں ڈاکٹر نعمان' طبیعت سے چھلک پڑنے والی عجلت کو جھٹک کر اس کیس کو انہماک دینے کے قابل ہو جائے' اپنی اُلجھن کو جھٹک دیا۔ سب جانتے تھے کہ معمولی اور غیر معمولی باتوں کی تفصیلات' جو مریض یا پھر کنسلٹ کرنے والا کوئی ڈاکٹر کسی کیس کے بارے میں دینا چاہتا تھا' ڈاکٹر نعمان اسے سننے کو پوری توجہ سے تیار ملا کرتا کہ بقول اس کے اسی میں بہت سی پیچیدگیوں کی کنجی ہوتی تھی۔ وہ اپنے جونیئرز کو بھی کیس ہسٹری توجہ سے لینے اور اس پر بھرپور توجہ دینے کی تلقین کیا کرتا جن میں سے اکثر عام سی' بے رس یا پھر غیر متعلق باتوں سے جلد ہی اُوب جایا کرتے تھے۔

''مین آغاز میں صرف سننا ہی ایک مفید کیس ہسٹری کی بنیاد بن سکتا ہے''

یہ ڈاکٹر نعمان کا نقطہ نظر تھا۔ سوالات کی اہمیت سے اسے انکار نہیں تھا مگر اس کا خیال

www.urduchannel.in

تھا کہ عموماً مصبی مریض اپنی خالص ذہنی پراگندگی کو تشخیص سے پہلے ہی انہی سوالات کے نتیجے میں کوئی اور جہت دے کر اُلجھا سکتے تھے۔ اس کا اپنا تجزیہ تھا کہ سائیکوانیل سز (Psychoanalysis) کے دورانیے میں بہت سے پیشنٹ اپنے معالج کے بے جا سوالات سے کانشی ایس ہو کر نفسی لذتیت میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے یا پھر نفسیاتی ایذا پرستی کو وتیرہ کر کے سائیکو ڈرامے پر اتر آتے تھے۔

ڈاکٹر نعمان نے اس کیس کی ساری ہسٹری پڑھ ڈالی تھی اور اسے بورڈ کے سامنے رکھنے سے ہچکچا رہا تھا کہ اس کیس میں کوئی کمپلی کیشن تھی نہ سوئیرٹی۔ مریض کو صرف پراپر کونسلنگ اور میڈیسن تھراپی چاہیے تھی۔ اس نے ڈاکٹر نوشین کو بلا کر اس حوالے سے کچھ مشورے بھی دینا چاہے مگر وہ اس روز لگ بھگ اتنی ہی اکتائی ہوئی تھی جتنا کہ ڈاکٹر نعمان میٹنگ والے روز نظر آ رہا تھا۔ وہ نیم ورکا حامی تھا' لہٰذا اس کی ساری نیم اسے باس کی بہ جائے ایک محترم دوست کی طرح سمجھتی تھی اور یہ طرزِ عمل اس ہسپتال کے حق میں خوب جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نوشین کا اکھڑا ہوا مزاج دیکھ کر اس کی تجویز کو تب تو مان لیا گیا مگر وہ اندر سے اچٹا ہوا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ یہ مریض اتنی توجہ اور ڈاکٹرز کے قیمتی ٹائم کو افورڈ اسی صورت میں کر سکتی تھی کہ کہ اسے ڈاکٹر نوشین کے علاوہ کوئی اور فالو کرتا۔ ڈاکٹر نوشین اس کیس میں اموشنلی انوالو ہو گئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر نعمان کو بتایا تھا کہ یہ یونیورسٹی کے زمانے میں اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔

سامنے والی اس نشست تک جاتے جاتے کہ جہاں سے اسے پریذنٹیشن دینا تھی' وہ بے طرح چھٹ جانے والی اس بے اطمینانی کو دل سے کھرچنے کے جتن کرتی رہی جو ڈاکٹر نعمان کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی اس کے اندر اتر گئی تھی۔ اس کے لیے اس نے یہ حیلہ کیا کہ اس نے ڈاکٹر نعمان کے چہرے کی طرف دیکھنا ہی موقوف کر دیا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر وہ لیپ ٹاپ پڑا تھا جس کے سی پی یو سے ملٹی میڈیا کو کنکٹنگ لیڈ کے ذریعے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے گھوم کر دیوار سے لگے اپنے اسسٹنٹ کو دیکھا تو اس نے ہال کی باقی روشنیاں مدہم

www.urduchannel.in

کر دیں۔ اب ڈاکٹر نوشین میں حوصلے اور خود اعتمادی کا تحرک پیدا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عثمان کے چہرے سے جو عجلت اس نے بہتی دیکھی تھی، اب وہ کہیں نہیں تھی۔ ہال کی مدھم روشنی نے، ملٹی میڈیا سے نکل کر کینوس کی دیوار پر پڑتی دودھیا تصویر نے، یا پھر اس کے اپنے تصور نے جو اب پوری طرح مربوط ہو گیا تھا سب کے چہروں پر دھندلاہٹ مل دی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ایسی لمبی تصویر دیکھ رہی تھی جس میں ابھرے ہوئے سارے نقوش اس نے میلی روشنی کے ریزر سے رگڑ رگڑ کر خود ہی مٹا ڈالے تھے۔

سامنے کینوس پر پڑنے والی روشنی کے اندر سے انگریزی کے حروف زوم اِن ہوئے۔ پاور پوائنٹ میں بنی ہوئی پریذنٹیشن کی پہلی سلائیڈ کے متحرک الفاظ جونہی پوری طرح ساکت ہوئے ڈاکٹر نوشین نے ذرا سا کھانس کر سب کی توجہ چاہی اور امید ظاہر کی کہ ان کی دِل چسپی اور توجہ سے وہ اس کیس کو پوری طرح ایکس پلین کر پائے گی۔

سب کی نظریں اب سامنے اجلے کینوس کی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ پہلی سلائیڈ صرف اس عنوان کی تھی:

''معالجین کے بورڈ کے لیے کیس ہسٹری کی تلخیص''

دوسری سلائیڈ میں ابتدائی نوعیت کی معلومات کے باوصف، خلافِ معمول قدرے کم طاقت کے ڈجیٹل کیمرے سے کھینچی گئی ایک عورت کی رنگین تصویر بھی تھی۔ معصوم سا چہرہ، نیچے دی گئی عبارت کی طرف متوجہ ہونے سے روک رہا تھا۔

ڈاکٹر نوشین کی آواز سارے میں ایک لذت بھری سسکاری کی طرح گونج رہی تھی:

''یہ ہے وہ عورت جس کی کیس ہسٹری آج ہماری پریذنٹیشن کا موضوع ہے۔''

اس نے اضافہ کیا:

''یہ تصویر میں نے اپنے سیل کیمرے سے لی ہے۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کی آواز میں ایک عجب طرح کی اپنائیت بھر گئی۔ تصویر کے نیچے کی معلومات کو ڈاکٹر نوشین نے ویسے ہی پڑھ دیا جیسے کہ وہ سلائیڈ پر دی گئی تھیں:

نام : نفیسہ بیگم

عمر : سینتالیس سال

جسمانی ساخت : قد پانچ فٹ پانچ انچ، وزن ایک سو سینتالیس پونڈ، رنگ سنہری مائل گورا، جلد صاف اور چمکدار

جسمانی صحت : بہ ظاہر کسی بیماری کے آثار نہیں؛ بل کہ قابل رشک حد تک صحت مند بدن

ازدواجی حیثیت : بیوہ

کیس کی نوعیت : دل کے دورے سے مر جانے والے اپنے شوہر کے بارے میں مریضہ کو یقین کی حد تک وہم ہو گیا ہے کہ اسے اس نے قتل کیا ہے۔

عین آخری سطر کو پڑھتے ہوئے اس نے ایک سرگوشی سنی:

''موروزم (moronism) کا کیس لگتا ہے۔''

اسے جان لینے میں قطعاً دیر نہ لگی تھی کہ یہ آواز ڈاکٹر انیس کی تھی۔

ڈاکٹر انیس کے مزاج میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ فیصلہ دینے اور اندازے قائم کرنے میں ہمیشہ پھرتی دکھاتا اور اپنا فیصلہ بدلنے میں بھی اسے کوئی تردّد نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نوشین بالعموم اُس کی اس طرح کی باتوں کو اگنور کر دیا کرتی تھی مگر اُس روز اسے نظر انداز نہ کر سکی اور لفظ چبا چبا کر کہا:

''نو، ڈاکٹر انیس، ناٹ ایٹ آل یہ کیس طفل دماغی کا نہیں ہے۔ اور خدارا بچوں کی سی جلد بازی سے گریز کیجیے۔''

ڈاکٹر انیس نے اسے خود پر براہ راست حملہ جانا تاہم وہ اس حملے سے پوری طرح سنبھل نہ پایا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھا اُسے لگا جیسے سب اُس کی طرف دیکھ رہے تھے کھسیانا ہو کر فوری طور پر اپنی پوزیشن واضح کرنا چاہی۔

''ڈاکٹر نوشین، میں فزیانومی (physiognomy) کو بھی قابلِ اعتماد علم مانتا ہوں اور آپ کی کھینچی ہوئی تصویر میں اس عورت کا چہرہ بچے کی طرح معصوم لگتا ہے، ایسے بچے کی طرح

جس نے بلوغت نہ دیکھی ہو۔ یہ تصویر اِس عورت کی ذہنی کیفیت بھی واضح.....

''نو کمنٹس ڈاکٹر انیس۔''

ڈاکٹر نعمان نے اُسے بات پوری نہ کرنے دی اور کیس کو مکمل طور پر سن لینے کی تلقین کی۔ ڈاکٹر نوشین نے سر جھٹکا اور اگلی سلائیڈ پر آ گئی۔ بعد میں آنے والی ہر سلائیڈ پر بلٹ فارم میں اِنفرادی جملوں کی صورت اَہم اشارے دے دِیئے گئے تھے تاہم اِن نامکمل جملوں سے ڈاکٹر نوشین نے ایک کہانی مکمل کر دی۔

ڈاکٹر نعمان کے لیے یہ کہانی وہ کیس ہسٹری نہیں تھی جو ڈاکٹر نوشین کی آواز سنا رہی تھی۔ وہ تو اس آواز میں اُترا ہوا تھا جو اِیک اور عورت کے وجود میں پوری طرح اُتری ہوئی تھی۔ اور جب ڈاکٹر نوشین نے عین آغاز میں یہ کہا تھا کہ یہ آج کے عہد کی ایک متروک مگر ناگزیر عورت کا کیس ہے تو وہ بہت دیر تک اِن جملوں کو معنی دینے میں اُلجھا رہا۔

×÷×

گھر کی جھاڑ پونچھ سے جونہی وہ فارغ ہوتی اُسے ہانڈی روٹی کا اِہتمام کرنا ہوتا کہ اُس کا شوہر انور عین دو بجے گھر کھانے پر پہنچ جایا کرتا تھا۔

یہ شروع ہی سے اُس کا معمول رہا اور اِس معمول کے ساتھ اُس نے خود کو یوں ڈھال لیا تھا جیسے گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی ہر بار ایک خاص وقت پر اپنے لیے مخصوص مقام پر پہنچتی تھی۔

دو بجے کھانا' پانچ بجے چائے اور ٹھیک آٹھ بجے پھر کھانا اور کھانے کے بعد باہر سڑک پر کچھ دور تک چلنا' جی بھر کر باتیں کرنا' کسی بھی موضوع پر یا پھر بے سبب ہنسنا اور قہقہے لگانا' واپسی پر انور کے پہلو میں ڈھے جانا حتیٰ کہ وہ اسے یوں ہی لیٹے رہنے پر مجبور کر دے یا پھر خود ہی آنکھیں بند کر کے حلقوم سے خرخراہٹیں اگلنے لگے۔ دوسری صورت میں وہ بغیر آہٹ کیے پھر کچن میں گھس جاتی گندے برتن صاف کر کے سلیقے سے رکھتی اور اس کے ساتھ نیند میں اُس کی شریک ہو جاتی۔ جب کہ پہلی صورت میں اگلی صبح اُسے اس کے جاگنے سے بہت پہلے اٹھنا

www.urduchannel.in

پڑتا تھا۔ غسل' نماز اور اس کے بعد انور کے لیے لمبی دُعائیں ... پھر وہی کچن ... حتیٰ کہ رات اِدھر اُدھر ہو جانے والی ساری ترتیب صحیح صحیح اپنے مقام پر بیٹھ جاتی تھی۔

یہ سب اس کے لیے عبادت کا سا ہو گیا تھا تب ہی تو اس گھر کی ایک ایک چیز سے انور کو اس کی محبت خوشبو اور نور کی طرح پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے سارے معمولات اس کے اندر سیکنڈ ظاہر کرنے والے نشانات کی طرح سما گئے تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک ہی محور پر گھومتی رات دن کی مسافت کو تین پہروں میں بانٹ رکھا تھا جو ایک خاص رفتار اور ڈھنگ سے گزرتے۔ ان پہروں کے دورانیے میں یکسوئی سے اپنے معمولات کا حصہ ہو جاتی اور سانس لینا بھی بھول جاتی تھی۔ تاہم ایک پہر کٹتا اور پلٹ کر دیکھتی تو سرشاری کی مہک اس کے بدن کو اجال دیتی تھی۔ ہر پہر کے آخر میں انور کو ایک ٹک بے ریا محبت سے دیکھتے رہنا' سانسوں کو پوری طرح سینے میں ہموار کر لینے کے لیے کافی تھا۔ اس طرح وہ ایک اور نئے پہر کو اپنے کامل انہماک سے کاٹ ڈالنے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

وہ انور کے بارے یقین کی جس دولت سے مالا مال تھی اسی یقین کو ایمان بنائے رکھنا چاہتی تھی۔

جب اس کے آنے کا وقت ہو جاتا تو وہ اپنے اس ایمان کو تازہ رکھنے یا پھر اپنے خوابیدہ ماحول کو استقبال کے لیے کچھ کے لگا کر تیار کرنے کو دھیرے سے کہہ دیا کرتی تھی۔

''دھوپ' بارش' آندھی' طوفان ناس مارے کس میں ہمت ہے کہ انھیں روک لے۔''

مگر اس روز جب وہ اَپنے آپ یہ بڑبڑائی تھی اس کی آواز میں ایک نامانوس سی تلخی بھی شامل ہو گئی تھی جس نے اُس کی آواز کو قدرے بلند کر دیا تھا۔ اَپنی ہی اَجنبی سی آواز اُس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک کر کھسیانی ہوئی۔ اُس نے بے اختیار باہر کی سمت نگاہ کی۔ ابھی انور نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا اور اپنے کام میں پہلے کی طرح مگن ہو گئی۔

اُسے اب کچھ زیادہ وقت نہیں چاہیے تھا۔

www.urduchannel.in

جب سے وہ اِس گھر میں آئے تھے' وہ اسے سیدھا کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ چیزیں یہاں وہاں ڈھنگ سے رَکھتے رَکھتے وہ بے سُدھ سی ہو جاتی تھی تاہم ہمت کر کے اُسے اُٹھ کھڑا ہونا پڑتا کہ اُپنے مزاج کے مطابق اَشیاء کو نہ دیکھ کر وہ چین سے لیٹ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ چیزیں گھسیٹ گھسیٹ کر اُن کی ترتیب بدلتی رہی؛ حتیٰ کہ اس کی اُپنی کمر دُھری ہونے لگی۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پر گر گئی۔ اگر چہ اُسے اُونگھ آ گئی تھی مگر خواب میں بھی وہ ایک ہی ایڑھی پر گھومتی رہی اور اُسے اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ کتنا وقت گزر چکا تھا۔

باہر کسی کی گاڑی نے ہارن دیا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھی' چونک کر گھڑی کو دیکھا' اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس کے شوہر کے آنے میں محض بیس منٹ رہ گئے تھے۔

وہ خوفزدہ نہیں تھی یہ تو سدھائی ہوئی محبت کا شاخسانہ تھا کہ معمول کے ٹھیک نہ بیٹھنے سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

ایک چولھے پر کُکر دَھرا تھا۔ دوسرے کا برنر ٹھیک طرح سے کام نہ کرتا تھا۔ ذرا سی گیس کم کھولو تو شعلہ بھبک مار کر بجھ جاتا۔ شعلہ بڑھائے رَکھو تو توے کا وسطی حصہ' جو کثرتِ اِستعمال سے پتلا ہو گیا تھا' بہت تپ جاتا' اتنا کہ اُدھر چپاتی ڈالو اُدھر رنگ سنہرا ہوا اور چپاتی درمیانی حصے سے پھولنا شروع ہو جاتی۔ کنارے اتنی جلدی پکتے نہ تھے لہٰذا اُسے ایک ہاتھ بار بار توے کے تپتے ہوئے کڑے پر رکھنے کے لیے ٹاکی اُٹھانا پڑتی؛ جو ہر بار چولھے کے نیچے کھسک جاتی۔ اُسے اِس کا اندازہ ہو جاتا تھا لہٰذا وہ اُنگلیاں لڑھکا کر اُسے تلاش کر لیا کرتی تھی۔ کڑے سے تو اکھینچ کر روٹی کے کچے رہ جانے والے حصوں کو سینکتے ہوئے اُسے اُپنے دونوں ہاتھوں کے یوں مصروف رہنے اور ٹاکی کے بار بار اِدھر اُدھر ہو جانے پر طیش آ رہا تھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اَب کُکر کے سیفٹی والو کو اوپر کھول کر گھومتے ہوئے ویٹ کو ہٹا دینا ہے؛ کہ اُسے بوٹیاں کھڑی کھڑی رکھنا ہی اچھا لگتا تھا۔ اُس نے اُپنے تجربے سے اندازہ لگا لیا کہ اگر یہ کچھ اور وقت گلتی رہیں تو آخر میں خود ہی ہڈی چھوڑ کر مزا کرکرا کر دیں گی۔

ایسے ہی ایک لمحے میں اُس کی نظر اُپنے ہاتھوں پر پڑی اور اُسے لگا تھا جیسے اُس کی ہڈیوں نے گوشت چھوڑ دیا تھا۔

کھانا پکاتے پکاتے یوں اپنے وجود کے بارے میں سوچنا' اُسے دِھیان ٹوٹنے جیسا لگا۔ ایسی مکروہ حرکت' جس سے اُس کی ریاضت میں رَخنے پڑ گئے تھے۔ اُس نے پھر سے دِھیان جوڑنا چاہا۔ اُس کی نظر بار بار کُکر کے جھوم جھوم کر گھومتے اور چھوں چھاں کر کے بھاپ چھوڑتے ویٹ پر پڑتی مگر جب وہ ٹاکی کی تلاش میں اُنگلیاں چولھے کے نیچے گھسیڑ رہی تھی تو یہ فیصلہ ہی نہ کر پاتی تھی کہ پہلے وہ کُکر کے سیفٹی والو کو کھولے گی' اس کا اُپنے ہی محور پر گھومتا اور جھومتا ویٹ اُتارے گی یا توے کے کڑے کو پکڑ کر اُسے ایک جانب کرتے ہوئے چپاتی کے کچے کنارے سینکے گی کہ اُس کی نظروں کو ہاتھ کی ہڈیوں سے اُچھلتے ہوئے گوشت نے جکڑ لیا تھا۔

وہ شروع سے ایسی نہ تھی۔ اسے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تو اپنا دھیان باندھ لیتی تھی۔ یوں سب مخمصے دھواں ہو جاتے تھے۔ چوں کہ وہ اندر سے اَڑیل اور خود سر نہ تھی لہٰذا بہت جلد اُسے' سب ہو چکے فیصلے اپنے کیے ہوئے لگنے لگتے۔ اس رویے نے اُسے اس قدر سہل اور اِتنا ہٹھا بنا دیا کہ اُس کا شوہر انور اس کے وجود سے بندھ سا گیا تھا؛ اُس پالتو جانور کی طرح جو ایک کھونٹے پر باندھ باندھ کر اس قدر سدھا لیا جاتا ہے کہ بعد ازاں گردن میں پڑی ہوئی رسی کھلی بھی رہے تو وہ خود کو اسی سے بندھا ہوا جان کر ہمیشہ وہیں آ کر کھڑا ہو جایا کرتا ہے۔

جب انور نے کار عین گیٹ کے سامنے روکی ہو گی تو معمول کے مطابق اُسے نیوٹرل کرنے' اور ہینڈ بریک کھینچنے کے بعد ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھایا ہو گا کہ اُس روز بھی یہ آواز ہر روز کی طرح اُس تک پہنچ گئی تھی۔ یہ آواز اِدھر اُدھر خطا ہو گئی کہ اُس کی نظر کو ہڈیاں چھوڑنے والے گوشت نے جکڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں جانتی کہ انور نے کتنی بار ایکسی لیٹر پر پاؤں کا بوجھ بڑھایا تھا؛ تاہم وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ انور نے ہارن نہ دیا ہو گا۔ عین گیٹ پر کار کھڑی کر کے ہارن دینا اُسے بہت معیوب لگتا اور ویسے بھی اُس نے اسے کبھی اتنا اِنتظار کرنے ہی نہ

www.urduchannel.in

دیا تھا کہ وہ اُکتا کر ہارن بجانے لگے۔ انور نے ہارن نہیں بجایا ہوگا مگر اس کا دِل وَسوسوں سے بھر کر زور زور سے ضرور بجنے لگا ہوگا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کار کے انجن کی آواز پر نہیں چونکی تھی بل کہ ڈھلکے ہوے گوشت نے خود ہی اُس کی نظروں کو چھوڑ دیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اَدھ پکی روٹی کو گھسیٹ کر توے سے ہٹا لیا اور مُڑتے مُڑتے ککر کے ویٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پہلے تو اُس کے اردگرد سے نکلتی بھاپ نے اُس کا ہاتھ جلایا اور پھر ویٹ کے لمس نے۔ اُس نے ارادہ بدل دیا اور چولھے کا شعلہ مدہم کرنے کو ناب گھما کر باہر نکل گئی۔

باہر اُس کا شوہر اَپنی کار میں یوں مُرا پڑا تھا کہ اُس کی طرف والا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا؛ ایک پاؤں نیچے جھول رہا تھا اور دوسرا ابھی تک ایکسی لیٹر پر جما تھا۔

×÷×

ڈاکٹر اتنی محویت سے ایک ایک تفصیل بتا رہی تھی کہ اُس کا سارا وجود ہال کی یخ بستگی کے باوجود پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ محبّت اور موت کے اس تذکرے نے ماحول کے پیالے میں ایک نامانوس سا لطف اور عجب سی بے کلی اُنڈیل دی۔ سب اَپنی اَپنی نشستوں پر ساکت ہو گئے سوائے ڈاکٹر نعمان کے جو مسلسل پہلو بدل رہا تھا۔

مدہم روشنیاں جیسے خود ہی معمول پر آ گئی تھیں۔

''بورڈ کے معزز ممبران۔''

ڈاکٹر نوشین نے اَپنی ننھی سی ناک کے نیچے جمع ہو جانے' اور شفاف پیشانی سے پھسل پھسل کر آنے والے پسینے کو ٹشو میں جذب کرتے ہوے کہا:

''ایک عورت اپنے وجود میں ہی زندہ رہتی ہے۔ اس کا کام کرنا بھی دراصل اس کے اسی وجود کی ایکسٹینشن ہوتا ہے اور ایک مرد ... ''

اُس نے جان بوجھ کر لمبا سانس لیا تھا' کسی بوجھ کو دِل سے اُتارنے کے لیے۔

''جی مرد تو اَپنے اختیار اور اَپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی دنیا سے نکلتا ہی نہیں ہے۔ عورت کا وجود بھی اس کے اختیار کی دنیا کا علاقہ ہے۔

مگر نفیسہ اور اس کا شوہر انور ان معمولی مردوں اور اُتھلی عورتوں میں سے نہیں تھے۔

یہی سبب ہے کہ مرد اَپنی عورت کی محبت میں مر گیا......

اور عورت اسے ایسا قتل گردان رہی ہے جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا......

اپنے آپ کو اَذیت دینے کے لیے وہ بار بار اَپنے ہاتھوں کا گوشت دانتوں سے کاٹ کاٹ کر زخمی کر ڈالتی ہے۔''

ڈاکٹر نوشین کی سانسوں کی بے ترتیبی اُسے مزید کچھ کہنے سے روک رہی تھی۔

''فوری شاک کے بعد کا منتل ڈس آرڈر' ڈپریشن یا پھر زیادہ سے زیادہ بیک ہسٹری کی بنیاد پر (Schezo) شیزو کیس بنتا ہے''

ڈاکٹر انیس نے ایک بار پھر عجلت میں تخمینے لگائے۔ ڈاکٹر نوشین نے اَپنی سانسوں کی پروا نہ کی اور اس بار بھی برسنے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کیا:

''نہیں ڈاکٹر انیس یہ ڈپریشن' منتل ڈس آرڈر یا Schizophrenia کا معمولی کیس ہے نہ idiocy کا' بل کہ یہ تو ...''

''ایک منٹ ڈاکٹر نوشین پلیز' ابھی آپ کو اَپنی رائے نہیں دینا چاہیے۔''

ڈاکٹر نعمان نے نوشین کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور خیال ظاہر کیا:

''اَبھی اِس کیس ہسٹری میں کچھ خلا باقی ہیں۔''

ڈاکٹر نوشین نے ایک بھرپور نظر ڈاکٹر نعمان پر ڈالی جو ریوالونگ چیئر میں دھنس کر کچھ اور چھوٹا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نعمان نے نوشین کی نظروں کو پرے دھکیلتے ہوے کہا:

''پہلے سوالات کا سیشن ہو جانا چاہیے۔''

''جی ضرور' موسٹ ویل کم۔''

وہ بول پڑی' جیسے پہلے ہی سے اس کے لیے تیار ہو۔ ممبران کے چہرے چغلی کھا رہے تھے کہ وہ اسے غیر معمولی کیس ماننے کو تیار نہ تھے۔ اُن کے سوالات سے ظاہر ہوتا تھا جیسے

www.urduchannel.in

وہ ایک عمومی کیس پر اُپنے وقت کے ضیاع پر بھی ناخوش تھے تاہم انھوں نے اب تک کی گئی کولسلنگ اور میڈیسن تھراپی کے حوالے سے کئی سوالات کیے۔ ڈاکٹر نوشین نے سب سوالوں کے جوابات نہایت تحمل سے دیے۔ تاہم پریذنٹیشن کے خاتمے تک اُس کا وجود ٹوٹنے لگا اور اُسے اندازہ ہوگیا کہ بہت جلد بخار اُسے آلینے والا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر نعمان کے آفس چل کر کافی پینے کی دعوت کو نظر انداز کیا' گاڑی نکالی اور سیدھا گھر چلی آئی۔

×÷×

اگلے ایک گھنٹے تک اُس کا بدن بخار میں پھنکتا رہا۔ اُسے سینے کے اندر اُوپر کی طرف ایک چبھن سی محسوس ہوئی جو بہت گہرائی میں اُترتی تو تھی پوری طرح معدوم نہ ہوتی تھی۔ بخار اور بھی تیز ہوا تو وہ اپنے بدن کی تپش اور سینے کی دُکھن سے بے نیاز ہوگئی۔ اسی کیفیت کے کسی لمحے میں وہ اُٹھی' چاروں طرف دیکھا تھا؛ سارے کمرے میں ایک خلا سا گونج رہا تھا۔ اس نے بغیر کسی پیش بندی کے اپنے آپ کو اس خلا میں جھونک دیا۔ حتیٰ کہ باہر اُسے کسی کار کے رُکنے کا احساس ہوا۔ آنے والے نے کار کا انجن بند کیا' نہ ہارن بجایا تھا۔ اُسے اشتیاق ہوا تھا اُس نے حیرت سے اس تصویر کو دیکھا جس میں وہ اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ مل کر اتنی بے ریا ہنسی ہنس رہی تھی کہ پوری تصویر روشن ہوگئی تھی۔ تصویر میں بیٹے کے چہرے کا رُخ ماں کی طرف تھا اور وہ خود اپنے شوہر کو گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے پورا منھ کھول کر ہنس رہی تھی۔ اُس کے شوہر کے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں سے دَب دَب کر مسکراہٹ یوں نکل رہی تھی جیسے گیلے ہاتھوں سے تڑپتی ہوئی مچھلی پھسلتی ہے؛ زور لگا کر اور اُپنے وجود کی چمک اُچھال کر۔ عین اُس لمحے اسے کافی پیئے بغیر گھر چلے آنا ایک فاش چوک لگا تھا۔

جب آنے والے نے ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھ کر انجن کی آواز پیدا کی تو اُس کا ہاتھ تصویر کو تھام چکا تھا۔ اب تو وہ باقاعدہ خود کو کوس رہی تھی کہ اتنی عجلت میں وہاں سے کیوں نکل آئی تھی۔ دوسری بار کار کے انجن کی آواز نے اُسے اس قدر حیرت اور بوکھلاہٹ سے دوچار کیا کہ اُسے خود کو کوسنا موقوف کرنا پڑا مگر اس اثنا میں تصویر پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔ وہ تصویر اُٹھانے

کو جھکی اور اُسے تھاما ہی تھا کہ ایک بار پھر ویسی ہی آواز آئی۔ اِس بار اُس کا دِل اُس کے حلقوم تک یوں اُچھلا کہ واپس اُپنے ٹھکانے پر بیٹھ نہ سکا۔ وہ باہر کی سمت لپکی مگر وسطی میز سے اُلجھ کر وہیں ڈھیر ہوگئی۔ پہلے تصویر کے فریم پر جمی اُنگلیاں ڈھیلی پڑیں اور جب فریم دبیز قالین پر بغیر آواز پیدا کیے گر گیا تو اس کا ہاتھ میز سے ڈھلک کر عین تصویر کے اوپر یوں جا پڑا' کہ اس کے نیچے ڈاکٹر نعمان کی دبی دبی ہنسی پوری طرح دفن ہوگئی تھی۔

×××÷×××

www.urduchannel.in

کتابُ الاموات سے میزانِ عدل کا باب

جس قدیم کتاب کو انھوں نے موت سے منسوب کر رکھا تھا اُس کے نیم تصویری باب میں ایک بہت بڑی ترازو تھی جس کے پلڑوں میں زنگار نے سوراخ کر دیے تھے۔ قدیم کتاب کے پاورقی حاشیے میں جو عبارت لکھی ہوئی ملی اس کو پڑھ لینے کا دعویٰ رکھنے والوں نے بتایا ہے کہ اس ترازو کو میزانِ عدل کا نام دیا گیا تھا۔ کتاب الاموات پر تحقیق کرنے والوں نے گزر چکے وقتوں کی نامانوس عبارت سے اِس واقعے کو بھی اخذ کیا ہے کہ اس میزانِ عدل پر خود کو تلوانے کی خواہش رکھنے والوں کو پہلے اس آتشیں گڑھے میں اُترنا ہوتا' جو راہ میں پڑتا تھا۔ اس ترازو کی راہ میں اور بھی بہت کچھ پڑتا تھا' گہری دھند' سرمئی بادل' کڑکتی بجلیاں اور کالی بارشیں۔ قدیم کتاب کے اُن صفحات پر جو ابھی تک کرم خوردہ نہیں ہوئے' اس طرح کی عبارت کی بھی نشاندہی ہوئی ہے جس کے مطابق یہ راہ کی رکاوٹیں دراصل شیطان مرڈود کی طرف سے ہوا کرتیں کہ جس کی آخری لمحے تک یہی کوشش رہتی تھی کہ کوئی میزانِ عدل تک نہ پہنچ پائے۔

اِس قدیمی میزانِ عدل پر جسم نہیں روحیں تُلتی تھیں۔

جسے ہم نے اپنی سہولت کے لیے اوپر شیطان مرڈود لکھ دیا گیا' اُسے ان خستہ اور بوسیدہ اوراق میں 'سُت' کا نام دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ دِیوتا تھا۔ یہ وہی ست دِیوتا ہے جس نے اپنے بھائی 'اَسر' کو قتل کر دیا تھا۔ ست اور اَسر کا یہ قصہ یوں دِلچسپ ہو

جاتا ہے کہ اَسر قتل ہونے کے بعد پھر زندہ ہو گیا تھا۔ اور اس زندہ ہو جانے والے دِیوتا پر قاتل دیوتا نے کئی گھناؤنے الزامات لگائے اور اُسے میزانِ عدل تک کھینچ لایا تھا۔

کتاب الاموات کے عبارت والے حصے میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اس واقعہ نے ست کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کوئی قتل ہو کر کیسے زندہ ہو سکتا تھا؟ بعد کے زمانے کے اپنے قاری کو اس مخمصے میں پڑنے سے بچانے کے لیے قدیم متن نے یہ وضاحت بھی محفوظ رکھی ہوئی ہے کہ مقتول ست بھی دیوتا تھا۔ انصاف کا دیوتا۔ لہٰذا اُس کا یوں قتل ہونا بنتا ہی نہیں تھا۔ ایک دیوتا اگر اپنے دیوتا بھائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا تو انہی قدیم روایات کے مطابق اُس کا پھر سے جی اُٹھنا بھی لازم تھا۔

بوسیدہ کتاب کے وہ حصے جو اَبھی تک زمانے کی دست برد اور تصرف سے جا سے محفوظ رہ گئے ہیں اُن میں مرقوم ہے کہ پہلے دونوں بھائیوں میں ایسی مخاصمت نہ تھی کہ ایک' دوسرے کو قتل کر دیتا اور دوسرا' اپنا مُقدمہ لے کر میزانِ عدل کی جانب رجوع کرتا۔ وہ بھائی جسے اُوپر شیطان سے تشبیہہ نہیں دی گئی ہے وہ ست کی خباثتوں کو دَرگزر کر دیا کرتا تھا۔ اس لیے کہ ایک تو وہ اُس کا بھائی تھا اور دوسرا یہ کہ وہ بھی تو آخر کو ایک دیوتا تھا۔ ضابطہ جو اپنایا جا رہا تھا' یہ تھا کہ ایک دیوتا بھائی کو اپنے دِیوتا بھائی کا پاس ہونا ہی چاہیے۔ اس عبارت کی تفہیم کرنے والوں نے کہا ہے کہ اَسر دِیوتا کو بھائی کا پاس تھا یا نہیں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم یہ یقینی تھا کہ وہ اپنے بھائی کی طاقت سے بہت خائف تھا۔ اُس کے بھائی کے پاس ایسے لوگوں کی سرداری بھی تھی جو اپنی پیٹھوں پر ڈھالیں اور بغل میں تلواریں سجائے رکھتے تھے اور گروہ کی صورت آگے بڑھتے تھے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تب تک کسی دِیوتا کو میزانِ عدل کے سامنے لا کھڑا کرنے کی روایت نہیں پڑی تھی۔ کیسے پڑتی کہ ست دِیوتا کے جی میں جو آتا اپنے پُشت پناہوں کے برتے پر نڈر ہو کر کرتا تھا۔

ست کیا کیا کرتا تھا؟ اس ضمن میں اس قدیم نوشتے میں ایک مُفصّل باب موجود ہے۔ اسی باب میں ذرا آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ ست دِیوتا نے میزانِ عدل کی طرف جانے والوں کو روکنے کے لیے توات کے علاقے کو بچھا دیا تھا۔ توات کے ایک سرے پر' جہاں کہ آسمانی سمندر کی نیلی لہریں ٹکرا ٹکرا کر ایک بھید بھری گونج پیدا کرتی رہتی تھیں لہٰذا وہاں وہ لوگ

www.urduchannel.in

بستے چلے گئے جن سے ان کے اپنے پاؤں کی زمینوں کے بھید چھین کر انھیں باہر دھکیل دیا گیا تھا۔ ان لوگوں کی اس زمین بدری کو ان کی مجبوری بنا ڈالنے کا وظیفہ ست دیوتا نے اپنے ایک پیارے کے ذمہ لگایا تھا۔ اِس پیارے نے توات کو ایسا علاقہ بنا ڈالا جس میں لوگوں کو سہولت سے اغوا کیا جا سکتا اور اُن کے پہلوؤں میں چُھرے گھونپے جا سکتے تھے۔ انھیں بوریوں میں بند کر دیا جاتا۔ حتیٰ کہ اُن کی روحیں الگ ہو جاتیں۔ اِن الگ ہو جانے والی روحوں کو اُن سیاہ گھوڑوں پر بٹھا کر اُمن تت لے جایا جاتا' جن کی چھاتیاں سفید تھیں۔

امن تت کی ترکیب سے اس علاقے کے امن سے تعلق کا مغالطہ ہو سکتا ہے۔ تاہم پرانی عبارتوں کو خواب جیسا جان کر ان کی تعبیر کرنے والے ایک مُعبّر نے وضاحت کی ہے کہ امن تت علاقے کا نقشہ اور اس میں جنگل اُگانے کی ترکیب میں یہ قرینہ تو ضرور پیشِ نظر رہا ہوگا کہ اُس کے اَندر کوئی جھانک نہ سکے۔ اور جو کوئی دُور سے دیکھے وہ اس سرسبز علاقے کو امن کا خطہ جانے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس علاقے کا انتخاب ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ میزانِ عدل اور اُس کے بیچ ایک اوٹ میسر آ جائے۔

تو یوں ہے کہ وہ اوٹ میسر تھی۔

ست کے حوصلے بڑھ گئے تھے یہاں تک کہ اُسے میسر آڑ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اِنصاف کا دیوتا اس کا اپنا ہی دِیوتا بھائی تھا۔ وہ بھائی جس کے دِل میں اُس کی قوت کا سہم بیٹھ چکا تھا۔ جن روحوں کو کالے گھوڑوں پر سوار کر کے امن تت لایا جاتا' انھیں ایک آرے سے چیر کر اُس گہرے گڑھے میں پھینک دِیا جاتا تھا جس میں روح خور درندے رہتے تھے۔ قدیم متن کے مطابق ارواح کے وہ حصے' جن کا تعلق بدنوں کے زِیریں حصے سے ہوتا تھا' ان درندوں کی چیر پھاڑ سے محفوظ رہتے تھے۔ تاہم بدنوں کے اُوپر والے حصے وہ رغبت سے کھاتے تھے۔ اپنا مرغوبہ کھا چکنے کے بعد وہ باقی بچ جانے اور تڑپے چلے جانے والے آدھے حصوں سے منھ موڑ لیتے۔ ایسے میں وہ منھ بلند کر کے ایسی خوفناک آوازیں نکالا کرتے تھے کہ آدھی تڑپتی روحیں اپنا تڑپنا بھول جاتی تھیں۔

موت کی اِس بوسیدہ کتاب کے جس حصے میں آدھی روحوں کا قصہ بیان ہوا ہے وہ

بہت کٹا پھٹا ہے۔ اتنا کٹا پھٹا کہ قدیم عبارتوں کو پڑھنے کا ہنر رکھنے والے اسے ڈھنگ سے نہیں پڑھ سکے ہیں۔ تاہم کتاب کے دوسرے حصوں کی عبارات کو اس حصے کے غیر مربوط متن سے ملا کر پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ روح خور درندوں کا اس طرح اُوپر دیکھ کر مکروہ آوازیں نکالنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا کہ ان کا دیوتائست ان کی طرف متوجہ ہو اور اسے یہ اطلاع بھی ہو جائے کہ وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ اُمن تت کے گڑھے سے آدھی بچ جانے والی روحوں کو تھسیٹ کر باہر نکالا جاتا اور انھیں سیاہ گھوڑوں پر لاد دیا جاتا۔ یہی سیاہ گھوڑے انھیں یہاں لائے تھے۔ اس بار چوں کہ اُن پر پہلے کے مقابلے میں آدھے سے بھی کم وزن لدا ہوتا تھا لہٰذا گھوڑے برق رفتار ہو جاتے۔

آدھی روحوں کو اُٹھا کر واپس بھاگنے والے گھوڑوں کی رفتار حد سے حد پہلے کے مقابلے میں دونی ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر قدیمی متن چغلی کھاتا ہے کہ واپسی پر اُن کی رفتار اس قدر تیز ہوتی کہ امن تت کی جانب جاتے سے کی چال سے اس نئی چال کے تناسب کا تخمینہ ممکن ہی نہ تھا۔ دانش وروں اور ماہرین نے اس سے یہ استخراج کیا ہے کہ ان روحوں کا غالب وزن اُوپر والے اس حصے کا تھا جو دماغ اور دِل سے کھینچ کر باہر نکالی گئی تھیں اور جنھیں روح خور درندے چٹ کر گئے تھے۔

امن تت کا گڑھا اُس گڑھے سے مختلف تھا جو میزانِ عدل کی راہ میں پڑتا تھا۔ میزانِ عدل کے ذِکر کے ساتھ جس گڑھے کا حوالہ آتا ہے' اُسے آتشیں گڑھے سے موسوم کیا جا چکا ہے اور اُس کی بابت یہ بھی بتایا جا چکا کہ اُس میں سے ہو کر ہی انصاف کے ترازو تک رسائی ہو سکتی تھی۔ اُوپر جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ست دِیوتا اس جانب آنے والے لوگوں کو روکنے کا ہر حیلہ کیا کرتا تھا' وہیں گہری دُھند' سرمئی بادلوں' کڑکتی بجلیوں اور کالی بارشوں کا ذِکر ہوا تھا اور انھیں شیطانی حیلوں کے زُمرہ میں رکھا گیا تھا۔ جب کہ بادل، بارش اور حاملہ ہوائیں قدرت کی عطا تسلیم کی جاتی رہی ہیں۔ قدیمی نسخوں کے ماہرین نے سارے حوالے اِکٹھا کرنے کے بعد کہا ہے کہ قدرت کے معاملات کا تعلق چوں کہ کتاب کے دوسرے حصوں میں ست دیوتا کے بہ جائے اسر دیوتا سے جوڑا گیا ہے لہٰذا یہاں یہ معاملہ مشکوک ٹھہرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہو نہ ہو سفید چھاتیوں والے سیاہ گھوڑے آدھی روحوں کو اُٹھا کر پلٹتے ہوئے' وہیں اُوپر سے' جست

www.urduchannel.in

لگاتے ہوئے گزرتے تھے۔ اُن کے بدنوں کی باقی ماندہ سیاہ جلد چھاتی کے سفید رنگ میں مل کر سرمئی ہو جاتی تھی۔ وہ اِتنی اونچی زقند بھرتے کہ نیچے سے اُن کے بدن سرمئی بادل لگنے لگتے۔ برق رَفتار گھوڑوں کے سُم ٹھٹھری ہوئے منظر کی چٹان پر پڑتے تو چنگاریاں اُٹھتیں۔ ان چنگاریوں کو بجلی کا لپکا سمجھا جاتا۔ وہ پانی جو گھوڑوں کے بدن چھوڑتے اُس پر بارش کا گمان ہوتا تھا۔

قدیم متون کا ذرک رَکھنے والے اس مخمصے میں پڑتے رہے ہیں کہ جب عدل سے منسوب اَسَر دیوتا نے اپنے دیوتا بھائی ست کی جانب سے سیاہ پٹی باندھ کر اَپنی آنکھوں کو بند کر رکھا تھا تو آخر وہ کیا افتاد ٹوٹ پڑی تھی کہ ست کو اِسی کی میزان سے رجوع کرنا پڑا۔ اِس پرانے نسخے میں لکھا ہوا ہے کہ اَسَر دیوتا کو اُن لوگوں کے بارے میں بہت تشویش تھی جو مسلسل غائب ہو رہے تھے۔ غائب ہونے والے جب کہیں بازیاب ہوتے تو وہ محض لس لس کرتے وجود رہ جاتے تھے۔ یہیں یہ المناک حقیقت بھی لکھی ہوئی ملتی ہے کہ وہ عہد سوچنے سمجھنے اور بے ریا محبت کیے چلے جانے والوں سے بہت سُرعت سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ جب عدم پتہ ہو جانے والوں کی عورتوں کے بین جگر پھاڑنے لگے تو اَسَر دِیوتا کو اَپنی کالی پٹی تھوڑا سا سرکانا پڑی۔ اُس نے ازخود نوٹس لے کر حقیقت کو میزانِ عدل پر چڑھانا چاہا۔ اُس کے بھائی ست دیوتا نے اسے اپنے خلاف ایک سازش جانا اور بپھر گیا۔ اُس نے طیش میں اپنے دیوتا بھائی کو آتشیں گڑھے کے اُوپر سے اَپنی جانب گھسیٹنا چاہا مگر ترازو کے اوپر نکلے ہوئے بانس پر بیٹھے چوکس بندر نے اَپنی بصیرت سے خطرہ بھانپ لیا۔ اس نے خوب شور مچایا۔ ست دیوتا نے بوکھلا کر اپنے دیوتا بھائی کو قتل کر دیا۔

کتاب الاموات کے چند اوراق پلٹیں تو اُوپر کو نکلے بانس پر بیٹھنے اور شور مچانے والا بندر اس دِیوی میں بدل گیا تھا جس کے نیچے کا بدن ڈھکا ہوا ہوتا تو اس کی زبان سچ بولتی تھی اور دیوی لباس گرا دیتی تو سارے بدن سے شہوت ٹپکتی تھی۔ یہ دِیوی جو ست دیوی پر بہت مہربان تھی، اس کے چہرے کی کرختگی کو پڑھ کر نامہربان ہو گئی تھی اور اپنا بدن سمیٹ کر سب کو اس کے مذموم ارادوں کی خبر دے رہی تھی۔ قتل کرنا ست دِیوتا کے لیے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر اس بار یہ اُسے مہنگا پڑا۔ وہ دِیوی جس نے بندر کی جگہ لے لی تھی اور کتاب میں جسے معات دِیوی کا نام دِیا گیا تھا، جگر پھاڑ دینے والی آوازوں میں اَپنی آواز ملانے لگی۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے احتجاج

کے نعرے بھی گونجنے لگے۔

جسے قتل کر دیا گیا تھا، اسے ان آوازوں نے زندہ کر دیا تو ست نے میزانِ عدل سے رجوع کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ کچھ مُعتبر یہ کہتے ہیں کہ اسر دِیوتا کو ان گونجتی آوازوں نے نہیں بل کہ پسد جست نے زندہ کیا جو بقول اُن کے، ایسے منصف دیوتاؤں کی مجلس تھی جو ترازو ہاتھ میں لیتے وقت آنکھوں پر سیاہ پٹی نہیں باندھا کرتے تھے۔ دوسرے مُعتبر اس تعبیر کو ماننے سے انکاری ہیں۔ وہ اس خوف کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو اس مجلس کے ہر رکن کے دِل میں کپکپاہٹ پیدا کرتا تھا۔ خیر حقیقت کچھ بھی ہو میزان عدل قائم کر دی گئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا، یہ کتنے وقت کے لیے تھی۔ وہ جسے قتل کیا گیا تھا، نیم زندہ ہو گیا تھا۔ عجب مقدمہ تھا، جس میں سے کئی اور مقدمے پھوٹ نکلے تھے۔ وہ دُھول اُڑائی جا رہی تھی کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ست دِیوتا مسلسل اُن گناہوں کی فہرست سب کو سناتا رہا تھا جو بقول اس کے، اَسَر دیوتا سے سرزد ہوئے تھے۔ امن تت کے علاقے سے بھی اس کے حق میں آوازیں اُٹھتی تھی کہ بقول اس کے یہ علاقہ بھی اُس کی طاقت کا استعارہ تھا۔

کتاب الاموات کی اس قدیم میزانِ عدل کا قصہ بھی عجیب ہے۔ قتل کا معاملہ سامنے کا تھا اور قاتل کو بہ سہولت اپنے انجام تک پہنچایا جا سکتا تھا مگر دِلوں کو لرزانے والے خوف کی ابتلا نے انھیں بوکھلا رکھا ہے۔ وہ فیصلے پر فیصلہ دیتے ہیں مگر ہر فیصلہ ادھورا رہ جاتا ہے حتیٰ کہ انھیں کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ ادھورے فیصلوں میں کئی اور قتل گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ دِیوتاؤں کے قوانین کی کتابیں ایک طرف دَھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یوں لگنے لگتا ہے کہ وہ بے معنی دلیلوں اور نامکمل فیصلوں کو ہی کافی سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے اپنے مقتولین پر بین کرنے والیوں کے گلے رُندھ گئے ہیں۔ احتجاجی نعروں کی گونج ماند پڑ گئی ہے اور معات دِیوی ادھر سے اُدھر کر اپنا جامہ گرا کر لوگوں کو رُجھانے میں مگن ہو جاتی ہے۔ وہ مُقدمہ کون جیتا؟ اسر دِیوتا یا ست دیوتا؟ کتاب الاموات کے اگلے سارے صفحات کو دِیمک نے کچھ اس طرح چاٹ ڈالا ہے کہ یہ سوال ہی بے معنی ہو گیا ہے۔

××÷××

www.urduchannel.in

کِکلی کلیر دِی

قلم ککلی ؟..... یہ کیا عنوان ہوا؟؟

اُسے اعتراض تھا۔ وہ میری تحریروں کی پہلی قاری تھی اور ناقد بھی۔

میں نے کہا:

تمھارے نزدیک قابلِ اعتراض لفظ ''قلم'' ہے یا ''ککلی ؟''

وہ اپنی گہری بھوری آنکھیں میرے چہرے پر جما کر کہنے لگی:

قلم بھی.....اور.....ککلی بھی۔

دونوں؟.....مگر کیوں ں ں ں ں؟

میں نے سٹ پٹا کر کیوں کو خوب کھینچ کر لمبا کیا۔ وضاحت چاہنے کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اضافہ کیا:

''دیکھو! قلم تو ہمارے پاس ایک مقدس امانت ہے۔''

وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ شوخی اُس کے گورے گالوں پر ناچنے لگی۔ کہا:

''اپنے جملے میں سے ''ہے'' کو ''تھا'' سے بدل لو۔''

پھر جھوم جھوم کر اور آنکھیں نچاتے ہوئے گنگنانے لگی:

''تھا کا مطلب تو تمھیں آتا ہوگا؟''

میں نے اُلجھ کر اُسے دیکھا تو وہ سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس نے کندھے اچکائے اور کہہ دیا:

''اب قلم جو کچھ لکھتا ہے اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔''

میں نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی شرارت پکڑ لی ہو۔ کہنے لگی:

''اَب یہ تھیوری چل نکلی ہے کہ لکھنے والا جب لکھتا ہے تو موضوع غائب اور مفہوم ملتوی ہو جاتا ہے۔''

میرے چہرے کی کھڈی پر حیرت کا لٹھا تن گیا۔ اُس نے وضاحت کرنے کی بہ جائے میری کم علمی پر طنز کرتے ہوئے کہا:

''حیرت ہے تم لکھنے والے ہو اور نہیں جانتے کہ لکھنے والا لکھتے ہی مر مرا جایا کرتا ہے۔''

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اُس نے وضاحت کی:

''یوں منھ کھول کر حیرت سے مجھے نہ دیکھو۔ میں تو اس تنقیدی فلسفے کا ذکر کر رہی ہوں جس میں لکھنے والے کی حیثیت ایک محرر سے زیادہ نہیں رہتی۔ اور ہاں اے میرے محرر! تم کسی مقدس امانت کا ذکر کر رہے تھے؟

اُس نے اچانک سوال لڑھکا کر مجھے بوکھلا دیا۔ میں نے اِسی بوکھلاہٹ میں رٹا رٹایا جملہ دُہرایا:

''قلم مقدس امانت ہے۔''

''مقدس امانت؟''

اُس نے منھ اوپر کر کے میرے لفظ اُچھالے اور قہقہہ لگا کر کہا:

''اب تو یہ امانت بکی ہے کہ یہ بازاری جنس ہو گئی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اب ہر متن کے معنی معطل اور ہر تحریر سے وابستہ تقدس متروک ہو جاتا ہے۔ اب تو تمھارے قلم سے نکلے ہوئے لفظ طوائف جیسے ہو گئے ہیں۔ یہ جس کے ہاتھ چڑھتے ہیں اُسی کے ہو جاتے ہیں۔''

کیا کہتی ہو؟ میں نے برہم ہو کر کہا۔ اس نے مجھے ٹوک دیا:

www.urduchannel.in

''میں نہیں کہتی' ایسا تمہاری تھیوری کہتی ہے۔ اب لکھنے والا سچ نہیں لکھتا کہ اسے ایک مبہم' مخلوط اور خطِ مستقیم سے گریزاں وسعتِ مکانی میں یوں لڑھکنا ہوتا ہے جیسے کوئی شرابی گھپ اندھیرے میں اوبڑ کھابڑ راستوں پر لڑکھڑاتا آگے بڑھتا ہے۔''

میں نے سر جھٹک کر کہا:

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

اُس نے اپنے سرخ ہونٹوں کو ایک دوسرے پر جما کر پٹاخہ بجایا:

''ایسا ہی تو ہو رہا ہے۔ اب تحریر سے وابستہ تقدس اور معنی بھی اس ٹشو پیپر کی طرح ہو گئے ہیں جسے استعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔''

میں نے ایک ایک کر کے ان ادیبوں کو یاد کرنا چاہا جو لفظ کے معنی اور معنی کے تقدس سے وابستہ ہو سکتے تھے۔ میں سوچتا چلا گیا حتیٰ کہ میں اندر سے لرزنے لگا۔ میں نے اُس کے سامنے شکست کی ہتک سے بچنے کا حیلہ کرنا چاہا:

''مگر میں تو.....''

''قلم کی عظمت کا قائل ہوں۔''

اُس نے میرے منہ سے جملہ اُچک کر مکمل کیا اور طیش میں آتے ہوئے کہا:

''قلم کا تقدس..... قلم کی عظمت قلم کی حرمت..... اور اب صارفیت کے فروغ کے لیے بازاری تھیوریاں یا پھر اینٹی تھیوریاں..... تم ادیبوں کے پاس بانجھ لفظوں کا کتنا ذخیرہ ہوتا ہے' بے دریغ استعمال کرتے ہو' نہیں' سوچے سمجھے بغیر۔''

اس کی آواز معمول سے کہیں زیادہ بلند ہوگئی تھی۔ میں جھینپ گیا۔ موضوع بدل دینا چاہا۔ اور..... ککلی پر کیا اعتراض ہے تمہارا؟

اس کی آنکھیں ماضی کی یادوں تلے بند ہونے لگیں اور ہونٹ میٹھے لفظوں کی لذت کو چاٹنے لگے:

''کِکلی کلیر دی

پگ میرے ویر دی ''

میں اُسے خواب کے برزخ سے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر کھینچ لایا:

''میں نے تو کِکلی پر تمہارا اعتراض جاننا چاہا تھا اور تم بچی بن کر ککلی گانے لگی ہو۔''

''ہاں! یہی تو اس لفظ کی خوبی تھی کہ بچھڑے بچپن کی اُنگلی تھما دیتا تھا۔''

اُس نے اپنا جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ میں نے بدلہ اتار دینا چاہا:

''اب تم ''تھا'' کو ''ہے'' سے بدل کر اپنا جملہ درست کر لو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر ہنسے چلی گئی۔ حتیٰ کہ اس کا بدن دہرا ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ پھر وہ یکلخت یوں چپ ہوگئی' یوں کہ سارے میں سناٹا قہقہے لگانے لگا۔ میں اُس کے چہرے پر بدلتے رنگوں کو حیرت سے تک رہا تھا۔ اور جب سنجیدگی اس کے چہرے پر کِکلی کھیل رہی تھی تو اس نے کہا:

''تم نے اپنے بچوں کے چہروں کبھی غور سے دیکھا ہے؟''

میں اس غیر متوقع سوال پر بھونچکا ہو کر اسے بٹر بٹر دیکھنے لگا۔ میں بہ ظاہر اسے دیکھ رہا تھا مگر بہت سُرعت سے یہ سوچنے کی جانب راغب بھی ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے بچوں کے چہرے کب غور سے دیکھے تھے۔ جب میرے حیرت زدہ چہرے پر سوچ کی کنڑی نے جالا بُن دیا تو وہ کہنے لگی:

''تمہیں کب فرصت ہے اس کی؟ تمہارا دفتر ہے' کمپیوٹر ہے' انٹرنیٹ ہے' بزنس میٹنگز ہیں' پارٹیاں اور آؤٹنگ ہے۔ اور لکھنا لکھانا بھی تو ہے' ہونہہ۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہارے اپنے معمولات ہیں۔ ایسے میں تمہارے پاس وقت کہاں کہ بچوں کے چہرے غور سے دیکھ سکو۔ تمہاری نظریں تو میرا چہرہ بھی ڈھنگ سے دیکھنا بھول گئی ہیں۔''

میں شرمندہ ہوگیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی تھی کہ ایک مدت سے میں اُس کا چہرہ حیرت سے دیکھتا تھا یا بوکھلاہٹ میں۔ محبت سے دیکھنا نہ جانے کب سے چھوٹ گیا تھا۔

www.urduchannel.in

مجھے جھینپتے پا کر وہ ماضی کے ان لمحات میں اُتر گئی جب میری نظروں کی آنچ سے اُس کے گورے گال تمتما کر سرخ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ ماضی سے جلد ہی لوٹ آئی اور میرے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگی:

''شرمندگی کے بیج بو کر ہم نے پچھتاوے کی فصل کے سوا اپنی آئندہ کی جنریشن کو برداشت کے لیے اور دیا ہی کیا ہے؟''

اب میں جس کیفیت میں تھا' اسے کوئی نام نہ دیا جا سکتا تھا۔ وہ میرے چہرے کے بدلتے رنگوں سے بے نیاز ہو کر کہنے لگی:

''جب سے آزاد تجارت اور منڈی کی معیشت نے اخلاقی اقدار کے تہذیبی ہونے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اپنی اخلاقیات مادے کے حوالے کر دی ہیں' رشتے بھی بے معنی ہو رہے ہیں۔ پہلے رشتے ضرورتوں کو حد سے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ اب ضرورتیں رشتوں کی حدیں خود قائم کرتی ہیں۔ جب سے صارفیت نے انسانی ضرورتوں کی پیداوار کا ٹھیکہ اپنے ذمہ لیا ہے' میڈیا وہ سبق پڑھ رہا ہے جو سرمایہ کار اسے پڑھا رہا ہے اور جو ہر انسان کے صارف ہونے کے لیے دینیات جیسا لازمی مضمون ہو گیا ہے۔''

وہ ہنسی ہے اور ہنستے ہنستے اُپنی بات مکمل کرنا چاہتی ہے:

''ہر شے جنس ہو گئی ہے۔ رشتے ناتے۔ میاں بیوی۔ بہن بھائی۔ حتیٰ کہ ماں باپ۔ کس کے پاس وقت ہے کہ اس دوسرے کے دل میں جھانک کر دیکھ سکے۔ اب سب کو مل بیٹھ کر دکھ سکھ نہیں بانٹنے کہ سب آسانیوں کی طلب میں پاگل ہوے جاتے ہیں۔''

میں نے اسے ٹوکا:

''ہمارے ہاں ابھی تک صورت حال اتنی بھی گمبھیر نہیں ہوئی اور مشرق میں ابھی تک خاندانی نظام باقی ہے۔''

اُس نے سانس کا لمبا دھاگا کھینچا اور کہا:

ہاں' مگر اے میرے دانش ور' ہمارے نیکنو کریٹس' ہمارے سیاستدان' ہمارے ادیب اور پڑھے لکھے لوگ' ہمارا مقتدر طبقہ اور ہمارا میڈیا ہمیں زبردستی کس جانب دھکیل

رہا ہے۔

میں نے وضاحت کرنا چاہی:

''دیکھو وقت بدل رہا ہے۔ ادیب اور دانش ور کا یہ منصب ہے کہ اپنے لوگوں کو زمانے کی ہوا سے آگاہ کرے۔''

وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ کہا:

''آگہی اور چیز ہے اور دوسروں کے فرسودہ نظریات کے لیے کچرے کے ٹرک بن جانا اور بات۔ افسوس کہ ہم اپنا سب کچھ تج دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُپنے آپ پر اعتماد نہیں اور ہمیں آنے والے لمحوں کا خوف کھائے جاتا ہے۔ ہمارا ماضی ہے نہ حال۔ مستقبل کا کوئی بھروسہ نہیں۔ لہٰذا ہم اُن کی طرف دیکھتے ہیں جنھوں نے علم اور تہذیبی مظاہر کی جگہ انفارمیشن گاربیج کو دے دی ہے۔''

''انفارمیشن گاربیج؟''

میں نے اُسے ٹوک کر پوچھا:

''ہاں انفارمیشن گاربیج۔ ایک ڈھیر ہے معلومات کا جو انٹرنیٹ کے ذریعے بہا چلا آتا ہے۔ اسی میں ننگی عورتیں بھی ہیں اور سائنسی فارمولے بھی۔ یہاں بے ہودہ مرد اور جنسی لذتیں بھی ہیں اور شعر و ادب کے چسکے کا سامان بھی۔ چلتے فیشن کی چڑی' نئے ڈیزائن کی نائیٹی' چٹ پٹے لطیفے' امریکہ کی دھمکیاں' تیل کی چڑھتی ہوئی قیمتیں جسے جو کچھ جاننا ہوتا یہیں سے اُچک لیتا ہے۔ یہ ساری معلومات ہم اپنے بچوں کو بھی دینا چاہتے ہیں۔''

''م م مگر۔''

میں نے اسے روکنا چاہا۔ وہ خود ہی رُک گئی تھی۔ اُس کی آواز اب جیسے بہت دور سے آ رہی تھی:

''ٹیوشن' ہوم ورک' ٹی وی ڈرامے' فلمیں' انٹرنیٹ اور لمبے دِن کی بے پناہ تھکن۔ معصوم چہروں کو بے ڈھب معلومات کے اس عفریت نے چھوڑ کر بوڑھا کر دیا ہے۔ اتنی تیزی سے گزرتے ہوئے طویل دن کی کوئی شام ان کھیلوں کے لیے نہیں ہے جو ساری عمر اُنگلی

www.urduchannel.in

تھامے رکھ سکتے ہیں۔لکن میٹی نہ کانچ کی گولیاں۔اینگن مینگن تلی تلینگن نہ کٹم کا ٹا۔گڑیا پٹولے نہ کھوکھو.....اور.....نہ ککلی۔جب بچوں کے پاس بچپن ہی نہیں رہا تو ککلی کیسی؟''

میں نے اُسے دیکھا۔اُسے بھی اور اس کی آنکھوں میں اُمنڈتے آنسوؤں کو بھی۔ اُس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔میں نے تب قریب آتے بچوں کو دیکھا اور یہ دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا کہ اُن کے چہروں سے بچپنا رُخصت ہو چکا تھا۔تب میں نے ذہن پر زور ڈالا مگر مجھے یاد نہ آرہا تھا کہ میرے بچوں نے یہ کھیل کبھی کھیلے بھی تھے یا نہیں۔

اس نے مجھے چھوکر اُپنی جانب متوجہ کیا اور کہا:

''اسی لیے تو میں نے ''ککلی'' کے ساتھ ''تھا'' کا لفظ لگایا تھا۔ککلی میں میری تیری نسل کے لیے اپنے ماضی کے حوالے سے شاید کچھ کشش باقی ہے مگر آنے والے نسل.....''

میرے دِل میں درد کی ایک لہر اُٹھی۔اُسے کچھ اور کہنے سے روکتے ہوئے کہا:

''پھر تو میں اس تحریر کا عنوان ''قلم ککلی'' ضرور رکھوں گا۔''

''کیوں؟''

اس نے پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھے اپنے بچوں سے نہ تو اُن کا تہذیبی ماضی چھیننا ہے نہ اُن کو مستقبل میں روبوٹ یا محض صارف بنانا ہے۔اور اس لیے بھی کہ مجھے اپنے قلم کو اُپنی تحریر کو اور اُپنی اولاد کو جنس ہونے سے بچانا ہے۔''

جب میں یہ کہہ رہا تھا تو میرا سینہ زور زور سے بج رہا تھا۔اس نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے کہا:''تم جذباتی ہو رہے ہو!''

''ہاں.....شاید۔''

میں نے تُرت کہا اور اضافہ کیا:''کیا کچھ امور میں جذباتی ہونا درست نہیں ہوتا؟''

اس سوال میں عجب طرح کا یقین تھا جس نے اس کی آنکھوں میں ایک مُدّت بعد پھر چمک بھر دی تھی۔یہ میرے لیے تصدیق کی چمک تھی کہ اس سے دور دور تک راستہ

روشن ہو گیا تھا۔وہ یکبارگی مسکرائی اور سارے میں مہک بھر گئی۔میں نے اس کی خوشبو سے اُپنی سانسوں کو معطر کیا' اپنے لفظوں کو اسی خوشبو سے غسل دِیا اور قلم کو محبت سے کاغذ پر سجدہ ریز ہونے دیا۔

قلم میں ایک مستی تھی کہ وہ ککلی ڈالنے لگا تھا۔

××÷××

آدمی کا بکھراؤ

سی سی یو میں کامران سرور کو کئی گھنٹے قبل لایا گیا تھا مگر اُبھی تک اُس کے دِل کی اُکھڑی ہوئی دھڑکنیں واپس اُپنے معمول پر بیٹھ نہ پائی تھیں۔ وہ اُپنے حواس میں نہیں تھا تاہم ڈاکٹر قدرے مطمئن ہو کر یا پھر اُکتا کر دوسرے مریضوں کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے ایک طرف ہو جانے کے بعد عالیہ نے اُس کے نتھنوں پر ایک جُنبش کو سرسراتے پایا۔ صدمے کی وہ دیرینہ جو اس کے اَندر دھول کی طرح جم چکی تھی' اسے جھاڑنے کی خواہش نے اُس کے دِل میں انگڑائی لی تو وہ فوری صدمے کے اثر سے نکل آئی۔

ایک ہی لمحے میں وہ اِس قابل ہو گئی تھی کہ ذہنی تناؤ کو جھٹک کر پہلے تو پھیپھڑوں میں محبوس ساری ہوا کو ایک ہی ہلے میں کھینچ کر باہر پھینک دے اور پھر لمبا سانس لے کر نئی ہوا کو اس کی جگہ لینے بھیج دے۔ سانس کے اس اَدل بدل سے اعصابی تناؤ ٹوٹ گیا اور تعطل میں پڑا کسل اس پر چڑھ دوڑا تو اُس کے اندر جھپکی لے لینے کی خواہش جاگ اُٹھی۔ وقفے وقفے سے اُس کی آنکھیں مند نے لگیں اور وہ بینچ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف کو لڑھکنے لگی۔ اسی کیفیت میں عین اس وقت کہ جب اس کا گرنا یقینی ہو رہا ہوتا وہ جھٹکا کھا کر سنبھلتی اور جم کر بیٹھ جاتی تھی۔ جب وہ کئی بار جھٹکے کھا چکی تو اُس نے اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر اپنے بازوؤں کو فضا میں اُچھالا' ٹانگوں کو تان کر سیدھا کیا' کمان کی طرح جھول کھا چکی کمر کے بل نکالے اور ایک بار پھر ایک

www.urduchannel.in

لمبی مگر بے روک سانس کو بھر لینے کی پوری گنجائش پیدا کرنے کے لیے اس نے کونوں کھدروں میں اُلجھی ہوئی سانسوں کو بھی کھینچ کھانچ کر باہر نکال پھینکا۔

عین اس لمحہ کہ جب دوسری بار اُس کے پھیپھڑے سانسوں کی تازگی سے آباد ہو رہے تھے' ایک لطیف گداز اس کے سینے سے پورے منظر نامے میں بھر گیا ... یوں' کہ مرتے ہوئے مریضوں نے بھی اس لمحے میں مرنا معطّل کر دیا تھا۔ عالیہ ابھی لمبی سانس کی تانت کا لطف پوری طرح نہ لے پائی تھی کہ اسے اپنے بدن کو چھیدتی بہت ساری نگاہوں کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اُس کے جسم کا گداز کس قدر حشر اُٹھا سکتا تھا' اس کا وہ اندازہ لگا سکتی تھی لہٰذا جھینپ کر اُس نے ایک جھٹکے سے بازوؤں کو نیچے گرا دیا۔ کھسیانی ہو کر چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا' چھاتیوں پر چڑھ آئی قمیض کی تہ کو کھینچ کر سیدھا کیا' ان پر آنچل کو جمانے کی کوشش میں انھیں مزید نمایاں کر دیا اور پوری کوشش کر کے اپنے آپ کو اِدھر اُدھر کے دھیان سے الگ کیا۔ وہ احساس اور توجہ کی حاضری کے ساتھ کامران کو دِیکھنے کے قابل ہوئی تو اندر کی جھینپ سے چھٹکارا پا چکی تھی لہٰذا کامران کے پاؤں کی جانب بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔

اگرچہ ابھی تک کامران اسی طرح بے سدھ پڑا ہوا تھا تاہم زِندگی کے ننھے منّے آثار اس کے نتھنوں سے اُس کے ہونٹوں پر منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خود کامران کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کتنی دیر گہری تاریکی میں ڈوبا رہا تھا۔ تاہم اب اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک نامعلوم سی سرسراہٹ' دبیز تاریکی کے ٹھہرے ہوئے پانیوں کو چھو کر گزر رہی تھی' یوں کہ اس گاڑھے اندھیرے میں جا بہ جا لہریں اُٹھنے لگی تھیں۔ یہ لہریں' بیر بہوٹی کی طرح ٹکر مار کر بے سدھ پڑے اس کے دِل میں ایک اُٹھان سی بھر رہی تھیں۔ چھاتی کی گہری کھائی میں لڑھکا ہوا اس کا دِل اب واپس اپنے ٹھکانے پر آنے کے جتن کر رہا تھا۔ لگ بھگ یہی وہ دورانیہ بنتا ہے جب کامران کے پورے وجود پر زِندگی سے اس کی محبت ایک تھرتھری کی صورت تیر گئی۔ اس حیات اَفزا تھرتھری کو اُس کے قدموں کی سمت بیٹھی عالیہ کے نازک دِل نے بھی بھانپ لیا تھا۔ اس نے بدلے ہوئے اس شخص سے اُنس محسوس کیا اور اطمینان کی ایک نظر اُس کے بدن پر ڈالی' ٹانگوں کو سکیڑ کر اوپر کیا اور وہیں قدموں میں کچھ مچھی ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

www.urduchannel.in

×÷×

اُس کے دماغ میں یوں گونج دار شور پیدا ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑا انجن گڑگڑا کر چل رہا ہو۔ اس گڑگڑاہٹ اور شور کو اس نے ایک بہت بڑے خالی کنٹینر سے جوڑ لیا جسے وہ خود کھلی طویل اور خالی سڑک کے بیچوں بیچ مسلسل دوڑا رہا تھا۔ اس نے اپنے پہلو میں دیکھا سیٹ خالی تھی۔ پلٹ کر اُپنی سیٹ کے پیچھے جھانکا وہاں ایک دیوار اُگ آئی تھی۔ اسی دیوار کے چورس روزن سے کنٹینر پر لدا اُچھلتا کودتا خالی پن اُس کے چہرے پر تیز بوچھاڑ کی طرح پڑنے لگا۔ اس نے پیچھے دیکھنا موقوف کر دیا۔ جوں ہی اُس کی بل کھاتی گردن سیدھی ہوئی اور وہ سامنے دیکھنے کے لائق ہوا تو اس کے حواس جاتے رہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے اِس قلیل دورانیے میں سڑک نعرے لگاتے اور چیختے چلاتے لوگوں سے بھر چکی تھی اور اس نے نہ جانے کتنوں کو روند ڈالا تھا۔ سڑک کا کھلا پن سمٹ گیا تھا۔ کامران نے بوکھلا کر اپنا پورا زور بریک پر ڈال دیا۔ پاؤں بریک پیڈل پر جھول کر رہ گیا کہ بریک کام ہی نہیں کر رہے تھے۔

لوگ مسلسل کنٹینر کے نیچے یوں گھسے چلے آتے تھے جیسے انھیں پیچھے سے دھکیلا جا رہا تھا۔ اُس نے بے بسی سے ایک بار پھر چورس شگاف میں دیکھا؛ وہاں سڑک کے درمیان دور تک کچلی ہوئی لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ اُس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا، گردن سیدھی کر لی۔ سامنے کی سڑک ایک دم خالی ہو گئی تھی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا' لوگ نہ نعرے۔ اگر وہاں کچھ تھا تو ایک خالی پن تھا جو اس کے بدن کے عین وسط میں گونج رہا تھا۔ کامران کو اپنا دِل ایک بار پھر ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کی کوشش کی تو اس کا وجود جھٹکے کھانے لگا۔ عالیہ نے تو جیسے اس کی بگڑتی حالت کو خواب میں دیکھ لیا تھا' ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی' ایک نظر کامران پر ڈالی جس کی سانسیں اُکھڑی ہوئی تھیں اور بدحواس ہو کر ڈاکٹر کو بلانے جانا ہی چاہتی تھی کہ وہ مانیٹر پر اُچھلتی لکیر دیکھ کر خود ہی چلا آیا۔ بہت دیر تک کامران ڈاکٹر اور نرسوں کے گھیرے میں رہا۔ عالیہ کا دِل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کی نگاہ عالیہ کے زرد ہوتے چہرے پر پڑی تو اُس نے اسے باہر بھجوانے کی ہدایت کی۔

کامران کی حالت کو اس بار سنبھلنے میں بھی کچھ زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے

جاتے جاتے خود سی یو سے باہر کاری ڈور میں جھانکا اور عالیہ کو حوصلہ دیا کہ سب کچھ ٹھیک تھا اور یہ بھی کہ وہ چاہے تو اندر آ سکتی تھی۔ وہ اندر آئی تو کامران کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی نہیں تھیں تاہم اس نے دھند میں بھی عالیہ کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اُپنی جواں سال بیوی کی طرف دھیان کا یوں جانا اسے اچھا لگا تھا۔

عالیہ کی طرف دھیان جاتے ہی وہ اُپنی سوچ کو ایک ربط میں لانے پر قادر بھی ہو گیا۔ وہ صاف صاف محسوس کر رہا تھا کہ یہ گھر کا بستر نہ تھا' وہ ہسپتال میں پڑا تھا۔ کندھوں کا عقبی علاقہ' ریڑھ کی ہڈی کا نچلا حصہ' چوتڑوں کی گولائیاں اور پنڈلیاں وہیں پڑے پڑے سن ہو گئی تھیں۔ وقفے وقفے سے ایک نئے اور الگ سے میٹھے سے درد کی لہر اُٹھتی جو بدن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ جاتی۔ اُس نے پہلو بدلنا چاہا مگر جسم نے اس کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا۔

بدن نے انکار نہیں کیا تھا' وہ تو کوئی حکم ماننے کی سکت ہی نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں عالیہ کے دھیان نے گرفت سے نکل جانا چاہا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ ایک بار پھر اپنے وجود کو یوں دیکھ رہا تھا جیسا کہ وہ محض ایک لاش تھا۔

بہت ساری لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ایک لاش۔

اس کی سوچ بہک رہی تھی لہٰذا اُس نے دھیان کے بکھراؤ کو سمیٹنے کے لیے اپنے دِن بھر کی مصروفیات کو ایک ترتیب میں لانا چاہا۔ صبح وہ اپنے معمول کے مطابق جاگا تھا۔ نیکسلا یونی ورسٹی میں ایک تقریب تھی' وہ وہاں گیا تھا۔ وہاں بھی سب کچھ معمول کے مطابق جا رہا تھا کہ ساتھ بیٹھے شخص کو اُپنے سیل فون پر ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔ اس نے ان باکس میں جا کر اس میسج کو پڑھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ کامران کو تشویش ہوئی عادتاً اس سے خیریت دریافت کی تو اس نے میسج سامنے کر دیا۔ جبراً اپنی ذمہ داریوں سے الگ ہونے والے عدالتی نظام کے چیف کے کراچی پہنچنے پر گولی چلنے سے کئی لوگ مارے گئے تھے۔ یہ پیغام پڑھنے کے بعد وہ وہاں نہیں ٹھہر سکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فوراً گھر پہنچ جائے مگر واپسی پر حکومتی ریلی میں پھنس گیا۔ وہ آگے نکلنا چاہتا تھا مگر ریلی کے آگے آگے چلنے والی پولیس کی گاڑیاں کچھ یوں ساری سڑک کو روک کر دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھیں جیسے ساری ریلی کو انہی کی قیادت

www.urduchannel.in

میں چلنا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد وہ اگلی گاڑیوں کو نیچہ دینے میں کام یاب ہوگیا اور گھر پہنچا تو نجی ٹی وی چینل کراچی کی سڑکوں پر لاشیں گرانے کا منظر دِکھا رہے تھے۔ اس نے چینل بدل دیا۔ سرکاری ٹی وی پر اس ریلی کا منظر دِکھایا جا رہا تھا جس میں وہ پھنس گیا تھا۔

×÷×

وہ ایک مُدت سے شہری زِندگی کے ہنگاموں میں کچھ اِس طرح مشغول تھا کہ اسے ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں تھا کہ دیہات کتنی تیزی سے بدل گئے تھے اور مسلسل بدل رہے تھے۔ گندم کٹنے کا جو منظر اُس کے دِھیان میں چل رہا تھا' کٹائی اور گہائی کی مشینوں کے آنے کے بعد اُس میں بہت زیادہ ترمیم ہو چکی تھی۔ تاہم اس کی اپنے گاؤں کے حوالے سے ٹھہری ہوئی نفسیات کا شاخسانہ تھا کہ اُس نے کسانوں کے دائیں ہاتھوں میں چمکتی ہوئی درانتیاں دیکھی تھیں۔ یہ درانتیاں ایک ترتیب سے اُوپر کو اُٹھتی تھیں' عین ایسے لمحے میں جب وہ اپنی چھاتیوں کا سارا زور لگا کر 'شاوا بھئی شاوا' کا نعرہ لگاتے ہوئے بائیں ہاتھوں کی مٹھیاں کھڑی فصل کے اگلے رڈے پر جما لیتے تھے۔ درانتاں کوندے اُچھالتی فصل کی جڑوں کے قریب جمی ہوئی مٹھیوں اور سطحِ زمین کے درمیان بہنے لگتیں اور اس کے ساتھ ہی فصل اپنے ہی کھیت میں ڈھیر ہوتی جاتی' وہی کھیت جس میں ابھی ابھی وہ لہرا رہی تھی۔

کیا وہ کھیت میں بچھتی فصل تھی؟ اور کیا وہ لاشیں نہیں تھیں؟؟..... وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ خالی طویل سڑک..... کئی ٹائروں والا لمبا چوڑا کنٹینر..... دھڑا دھڑ گرتی ہوئی لاشیں..... اور آدمیوں کا سیلاب جو موت سے نہیں ڈرتا تھا..... وہ سب کیا تھا؟؟؟..... اس نے کبھی کوئی کنٹینر نہیں چلایا تھا' بل کہ یوں تھا کہ جب وہ اپنی کار میں کہیں جا رہا ہوتا اور اس طرح کے کسی کنٹینر کو اوورٹیک کرنا ہوتا تو اس لمحے جب وہ نصف کے لگ بھگ اوورٹیک کر چکا ہوتا' بوکھلا جایا کرتا تھا۔ ایسے میں نہ جانے کیوں' اسے یہ وہم ہونے لگتا تھا کہ کنٹینر کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کی اُنگلیاں اسٹیئرنگ پر اور مضبوطی سے جم جاتیں اور بغیر کسی ارادے کے پاؤں ایکسیلیٹر پر اپنا دباؤ بڑھا دیتا۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی ایسی کار تھی جس کے شاک بہت اچھے تھے۔ اتنے اچھے کہ کار سڑک پر بچھ کر اور جم کر چلتی تھی اور آدمی کے دھیان کو بھی جھٹکا نہیں لگتا تھا۔

اس نے دِھیان جھٹک کر ایک نئی ترتیب میں لانا چاہا۔ اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اُپنی یادداشت میں اس کنٹینر کے چلے آنے کو اس منظر کے ساتھ جوڑ سکے جو اس نے ایک ٹی وی چینل پر رات ہی کو دیکھا تھا۔ ایک سنسان سڑک کو بند کرنے کے لیے یہی کنٹینر کچھ اس طور کھڑا کیا گیا تھا کہ کوئی بھی سڑک عبور نہ کر پائے۔ پاس ہی کھڑے ٹرک کے سارے ٹائروں سے ہوا بری طرح نکال دی گئی تھی، یوں کہ اب اس کے ساتھ چلنے کا تصور باندھنا ممکن نہیں رہا تھا مگر کامران نے جو دیکھا تھا وہ کنٹینر تو اپنے پاور فل انجن کے زور پر پوری رفتار سے کھلی سڑک پر' بل کہ لوگوں کے بدنوں پر بھاگ رہا تھا اور اس کی پشت میں' چورس روزن' اور کنٹینر کے عقبی اچھال سے پرے کچلی ہوئی لاشیں بچھ رہی تھی۔ دفعتاً ایک نیا منظر پہلے فریم کے اندر سے اُبھرا۔ اسی ٹرک کی اگلی نشست پر ایک شخص جھول رہا تھا۔ گولی اس کی گردن میں پیوست ہوگئی تھی۔ جہاں گولی کا چھید تھا وہاں سے خون دھار بنا کر بہ رہا تھا۔ کامران نے اسے پہچاننا چاہا تو یہ دیکھ کر بوکھلا گیا کہ بُری طرح مضروب شخص کوئی اور نہیں وہ خود تھا۔

اُپنی گردن میں دھنسی گولی کے خیال نے اس کی بوکھلاہٹ کے ساتھ اس اُلجھن کو بھی نتھی کر رکھا تھا کہ وہ اس گولی کو کیسے نکالے گا؟ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے گردن کے چھید سے اُبلتے لہو میں راستہ بنایا اور اُسے اندر تک گھسیڑتا چلا گیا۔ اُسے اس پر بھی حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ ایسا کرتے ہوئے اسے کوئی درد کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ زخم ٹٹولتے ٹٹولتے اس کی شہادت والی انگلی کا ناخن گولی کے چپٹے سرے سے ٹکرایا۔ اس نے ہمت کر کے ساتھ والی دوسری اُنگلی بھی زخم میں ٹھونس لی۔ دوسرے ہی لمحے میں گولی اس کے ہاتھوں میں ناچ رہی تھی۔ خون اُبلنے لگا تھا۔ گولی اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی لاشیں گرنے اور مدد مدد پکارنے کے وہ سارے مناظر جو اس نے رات بھر اپنے ٹی وی پر دیکھے تھے' ایک ترتیب میں ڈھل گئے۔

×÷×

عالیہ نے کامران کی ہتھیلی کی پشت میں کُھبتے ہوئے کینولا کو دیکھا۔ اس سے جُڑی پلاسٹک کی نالی میں کچھ وقت پہلے تک قطرہ قطرہ گلوکوز بہ رہی تھی۔ اسی پلاسٹک کی تھیلی میں ڈاکٹر

www.urduchannel.in

نے کئی قسم کی دوائیاں انجیکٹ کر دی تھیں جو اب کامران کے خون کا جز ہو چکی تھیں۔ اُڑنے کے لیے پر تولتی تتلی کی طرح کینولا کے دونوں پر پھیلے ہوئے تھے اور عین وہاں جہاں تتلی کا سر ہونا چاہئے' وہاں گلو کوز ختم ہونے کے بعد ایک ڈھکن لگا کر خون کو پہنچنے سے روک دیا گیا تھا۔ اس نے ڈھکن کی تمام اطراف سے خون کو جمے ہوئے دیکھا تو بے چین ہو گئی۔ نہ جانے اسے یہ کیوں لگنے لگا تھا کہ کامران کے بدن میں بس اتنا ہی خون تھا جو باہر اُبل کر جم گیا تھا.....اور.....اب اس کے زرد ہو چکے وجود میں خون نہیں خالی پن دوڑتا تھا۔

جس خالی پن کو وہ ساری عمر پرے دھکیلتی رہی تھی وہ کسی نہ کسی بہانے اس کے اپنے وجود کا حصہ ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ہاں تھی تو وہیں سے اس خالی پن کو اپنے وجود کا حصہ بنا لیا تھا۔ اس کی ماں جب تک زندہ رہی ایک عجب طرح کے خاندانی زعم میں مبتلا رہی۔ وہ شہر میں پلی بڑھی اور اس ماحول میں جوان ہوئی تھی جس میں آسائشیں مزاج کا حصہ ہو جاتی ہیں۔ اس ترنگ میں احساس کی سطح پر جڑنے سے کہیں زیادہ یہ اَہم ہوتا کہ وقت کے ایک ایک لمحے کو پھلجھڑی کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ جل کر تماشا دکھانے' بجھنے اور پھر معدوم ہو جانے والی پھلجھڑی۔ ماں مر کر معدوم ہو گئی۔ عالیہ اپنی ماں کے جتنا قریب ہو جانا چاہتی تھی اس کی کسک دل میں پالتی جوان ہو گئی تو گھر خالی پن سے گونج رہا تھا۔ کامران جو اس کے سامنے پڑا تھا اس کے باپ کا دوست تھا جو اپنی پہلی بیوی سے الگ ہو گیا تھا۔ کیوں؟ یہ سوال اس کے باپ کے لیے اَہم نہ تھا۔ اس کے لیے سب سے اَہم بات یہ تھی کہ اپنے اثاثوں کے اعتبار سے وہ بہت مستحکم تھا۔

اِستحکام آدمی کے اندر کہاں سے آتا ہے؟.....کامران نے اپنے کانپتے دل کو تھاما اور سوچا مگر یہ سوال اس کے اندر چکراتا اور بدن کی باطنی دیواروں سے دیر تک ٹکراتا رہا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اسے ایسا تہذیبی آدمی کہا جا سکتا تھا جسے ثقافتی بارشوں کی بوچھاڑ نے پس پا کر دیا تھا۔ اس کی پہلی بیوی فائزہ کو ہمیشہ شکایت رہی تھی کہ اس کے اندر گاؤں کا ضدی اور اکھڑ کسان دھرنا مارے بیٹھا ہوا تھا۔ زمین سے اُگا ہوا اور اپنے ایمان کے ساتھ جڑا ہوا آدمی۔ زمین پیچھے گاؤں میں رہ گئی تھی اور وہ ایمان ساتھ لیے پھرتا رہا۔ فائزہ چاہتی تھی کہ وہ

تیزی سے ترقی کر کے سوسائٹی میں مقام بنا لے مگر جس بوجھ کو وہ اٹھائے پھرتا تھا وہ اس کی چال میں رخنے ڈال رہا تھا۔ وہ اس پر مسلسل کام کرتی رہی حتیٰ کہ اسے بدلنا پڑا۔ اس نئی دنیا اور نئی چال کا اپنا ہی آہنگ تھا۔ پہلا قدم طعنے سن سن کر طے کیا تھا۔ پھر یوں بدلا کہ فائزہ بھی اسے' بالکل بدل جانے سے نہ روک پائی تھی۔

کامران جیسے دیہاتی آدمی کا بے ہنگم بدلنا کہ جس کی زندگی ایک خاص آہنگ میں چل رہی تھی اپنی جگہ ایک واقعہ تھا مگر اس سریع تبدیلی نے اس کے اندر خلا پیدا کر دیا۔ ایک ایسا خلا جو اس کی پچھلی زندگی کو اندر سے کاٹ کر پھینک دینے سے بن گیا تھا۔ فائزہ میں اتنی ہمت' فراست اور صلاحیت نہ تھی کہ وہ اس خالی پن کو کسی اور ادا سے پاٹ سکتی کہ وہ تو ڈھنگ سے نہ وہ لطف دے پاتی جو اس کا وجود مانگتا تھا اور نہ ہی اس رفتار سے چل پا رہی تھی جس سے اب اس کا شوہر چل رہا تھا۔ وہ راستے کی دھول ہو گئی تو عالیہ اس کی زندگی میں آ گئی جس نے پہلے پہل تو نئے پن کے جوش میں اسے بہت قریب کر لیا تھا۔ اس نے بھی اس عرصے میں کئی رخنے پاٹ دیے ہو ں گے مگر وہ ایک اور ہی طرح کا خالی پن ساتھ لے کر آئی تھی جو سارے میں دندناتا پھرتا تھا۔

گوشت پوست کے آدمی کے اندر کیا کچھ سما سکتا تھا اس کا اندازہ کامران کو صحیح طور پر تب بھی نہ ہو سکا جب وہ اس میں بہت کچھ گھسیڑ چکا تھا کہ اب بھی وہ خالی کنستر کی طرح بجتا تھا۔ وہ ڈھنگ سے اس خاموشی اور خلا کی اس گونج کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہتا کہ وہ مسلسل ایک کیفیت میں رہنے سے احساس کی اس سطح سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ایسے میں اس پر جھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ اس نے اس جھلاہٹ سے چھٹکارے کے لیے خود کو خوب تھکانے اور مسلسل مصروف رکھنے کا حیلہ کیا اور اس حیلے ہی کو اپنی عادت بنا لیا۔ شروع شروع کا وہ زمانہ جو اس نے اڑیل بیل کی طرح ٹھہر ٹھہر کر گزارا تھا اس کے تمام ہوتے ہی وہ محسوس کی دنیا سے جست لگا کر طلب کی دنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ احساس کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اس کے ناتے رشتوں کے ساتھ جڑ جاتا اور روحانی طہارت کے دریچے بدن پر کھول لیا کرتا تھا جب کہ طلب کے تقاضے کچھ اور تھے کہ یہ پہلے تو ضرورت بنتی اور پھر ہوس ہو کر حواس پر چھا جاتی گئی تھی۔ کامران کے جسم میں ہوس ہی ہوس

www.urduchannel.in

بولنے لگی تو اس کے مطالبے فائزہ پورا کر سکنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ اگرچہ اس خلا کو عالیہ نے بھر دیا تھا مگر جو خالی پن وہ اپنے بدن میں چھپا کر لائی تھی اسے کامران کے بدن کا ضعف پاٹنے سے قاصر تھا۔ اس کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ وہ احساس کی وہ سطح چھونے کا جھنجھٹ ہی نہ پال سکتا تھا جس میں تعلق گہرا ہو کر روحانی چھب دینے لگتا ہے۔ پہلے پہل آسائشوں اور بدنوں کی تندی تیزی نے معاملے کی نزاکت کو پرے دھکیلے رکھا پھر عالیہ خود ہی اپنے اندر سمٹ گئی اور کامران کی طنابیں ڈھیلی چھوڑ دیں وہ تو جیسے یہی کچھ چاہتا تھا جلد ہی اپنے آہنگ پر لوٹ گیا۔

×÷×

جب تک اسے فرصت میسر آتی تب تک عالیہ اپنا بدن توڑ کر ایک پہلو پر یوں ڈھے جاتی کہ اگلے صبح ہی اٹھا کرتی۔ کامران ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی وژن کے چینل بدلتا رہتا۔ کبھی تو وہ اتنی تیزی سے چینل بدلتا کہ پورا ہیڈ روم پلکیں جھپکتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسے میں اس کا ہاتھ ان ہاٹ چینلز پر بھی نہ رکتا جو ایک عرصہ تک اسے بہت مرغوب رہے تھے' ننگی رانیں اور کھلے سینے دکھانے والے ان چینلز کو دیکھتے دیکھتے وہ فائزہ سے اُوب گیا تھا اور اب جب کہ عالیہ اس کے بالکل پاس تھی اسے نیلے پانی میں نہاتی' ریت پر دوڑ دوڑ کر اپنے اعضا نمایاں کرتی عورتوں والے مناظر دیکھتے ہی اَپنی چھاتی بیٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب تک آسائشوں کے لیے ترستا اور فائزہ کے طعنے سنتا رہا تھا اسے خبروں والے چینلز میں دل چسپی رہا کرتی تھی۔ دنیا جس طرف جا رہی تھی اس پر وہ کڑھتا تھا۔ مگر جب وہ دنیا کی رفتار کے آہنگ میں آیا تو وہاں پہنچ گیا جہاں فائزہ اُس کا ساتھ نہیں دی سکتی۔

جن دنوں اسے معمول کی خبروں سے کوفت ہونے لگی تھی ان دنوں اس نے ایسے چینلز ٹیون کر لیے تھے جو بریکنگ نیوز کی تھرل سے جڑے ہوئے تھے۔ ٹکڑوں میں آنے والی خبروں میں بہت کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ لاشیں گرائے جانے والے مناظر سے لطف لینے لگا' بالکل یوں کہ جیسے عالیہ مضبوط جسم والے ریسلرز کی ان کشتیوں سے لطف اُٹھاتی تھی جن میں کوئی قانون اور ضابطہ کام نہ کرتا تھا۔ کچھ عرصے سے آدمیوں کے گم ہونے یا پھر ان کے مارے جانے' دھماکے ہونے اور بدنوں کے چیتھڑے اڑنے کی خبروں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ اس تسلسل

نے اس کی نفسیات کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہاٹ چینلز سے اس کے دل کے اوبنے کی وجہ عورت کے وجود سے وابستہ اگر چپٹ پنے اور لذیذ مناظر کی بہتات تھی تو دھماکوں میں بدنوں کے اڑتے چیتھڑوں کی متواتر خبروں نے اس کے اندر سے انسانی وجود کی وقعت ہی ختم کر دی تھی۔

جس روز نیکسلا سے آتے ہوئے وہ سرکاری جلوس میں پھنس گیا تھا اسی روز وہ دیر تک کراچی میں گرائی جانے والے لاشوں کے مناظر بہت دل چسپی سے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا دل معمول کے مطابق دھڑکتا رہا۔ عالیہ اس کی توجہ پانے کے لیے کوئی نہ کوئی بات چھیڑتی رہی۔ یہ باتیں ''ہاں' ہوں'' سے زیادہ پر اسے مائل نہیں کر پا رہی تھیں۔ ایک چینل جس کے لوگ اَپنی عمارت میں پھنس کر رہ گئے تھے اس کی خاص توجہ پا گیا۔ اس چینل کی عمارت کے دونوں طرف گولیاں چل رہی تھی لہٰذا وہ تھرل سے بھرے ہوئے مناظر فراہم کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ایک گروہ نے نیچے پارک کی گئی گاڑیوں کو توڑنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے ہجوم گاڑیوں کی چھتوں پر لوہے کی سلاخیں برساتا یا ونڈ سکرین کے ٹکڑے فضا میں اچھلتے تو اسے اپنے خون میں عجب طرح کی تیزی محسوس ہوتی۔ اس چینل کا کیمرہ مین بڑا جی دار نکلا۔ وہ عمارت کے اوپر کہیں پاؤں ٹکائے سارا منظر براہِ راست دکھانے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ پولیس والے وہاں ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ کر رہے تھے۔ جب سے سیاسی کارکنوں کو پولیس میں بھرتی کرنے اور مخالفین کو دبانے کے لیے سرکاری وسائل کے بے دریغ استعمال کی ریت چلی تھی ایسے مناظر تواتر سے نظر آنے لگے تھے۔ بھاگ بھاگ کر آگے آنے اور گولیاں برسا کر عمارتوں کی آڑ لے لینے والے ان کی پروا تک نہ کرتے تھے۔ گویا ان کے لیے سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر کمرے میں پھیلے خلا کو ماپا اور پھر اپنے پہلو میں پڑے جوان سال خوب صورت جسم کو دیکھا۔ دہشت کے ان لمحات نے اس کی کشش قضا کر دی تھی۔ عالیہ نے اپنے مرد کو متوجہ پا کر جلدی میں کچھ کہا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا اس میں کامران کے لیے کوئی دل چسپی کا سامان نہیں تھا۔ عالیہ اپنے تئیں جس پہلو سے نیم دراز تھی اس میں اس کے چھاتی کے ابھار نمایاں ہو کر اسے متوجہ کر سکتے تھے مگر اس ادا نے بھی اس کی توجہ کو گرفت میں نہ لیا کہ اس نے دل ہی دل میں اس

منظر کو بھی ایسے معمولی مناظر سے مماثل سمجھ لیا تھا جو انگلش میوزک نشر کرنے والے چینل ہر دوسرے فریم میں دکھاتے تھے۔ کامران نے اُپنی نظریں پھر ٹی وی کی اسکرین پر مرکوز کر دیں۔

وہاں اب ایسی لاش دکھائی جا رہی تھی جس کی چھاتی سے خون ابلتا تھا۔ چھاتی ... وہ بوکھلا گیا اور پلٹ کر اس چھاتی کو دیکھنا چاہا جس سے خون نہیں' گداز اُبل رہا تھا۔ وہاں منظر بدل گیا تھا۔ عالیہ نے کامران کی توجہ پانے میں ناکام ہو کر پورے بدن کو اوندھا یا اور آنکھیں موند لیں تھیں۔

×÷×

جب کامران کی ساعتوں میں باہر کی سرسراہٹیں بھی رسنے لگیں تب تک عالیہ کی سانسوں کی پھوار نیند کے خلیے سے آہنگ پا کر اس کے دائیں پاؤں کے ٹخنے پر پڑنے لگی تھی۔ اسے پہلے پہل سمجھ نہیں آیا کہ اس کے ٹخنے پر کیا ہو رہا تھا تاہم عالیہ کے سینے کا گداز اور گرمی لیے سانس کے ان جھونکوں نے اس کے حواس کی طرف پلٹنے کے عمل میں سرعت پیدا کر دی۔

کامران کا اپنے وجود میں اپنے آپ کو ریزہ ریزہ ڈالنے کے باقاعدہ جتن کرنا اور عالیہ کا سانسوں کے آہنگ کی تاثیر سے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے ٹانگوں کو پھیلائے چلے جانا' ایک ساتھ شروع ہوا تھا۔ جب ایک ہی رُخ پر پڑے رہنے کی وجہ سے عالیہ کا ایک پہلو دُکھنے لگا تھا اور اس نے چت لیٹ جانے کے لیے نیند ہی نیند میں اپنے پورے وجود کو حرکت دی' تب ایک نوجوان ڈاکٹر' جو اس کے قریب سے گزر رہا تھا' وہاں ٹھہر جانے پر مجبور ہو گیا۔ ڈاکٹر تب تک وہاں رکا رہا جب تک عالیہ کا جسم پشت پر جم کر جھولتا رہا۔ اس نے پیشہ ورانہ احساس کے تحت قصداً ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مریض پر ڈالی اور اس مانیٹر پر بھی جس میں سے کوئی فوری خطرہ نہیں جھانک رہا تھا۔ مریض کے جسم میں حرکت پا کر ڈاکٹر بالاسب کھسیانا ہوا' منہ سیدھا کیا اور وہاں سے کھسک گیا۔

سی سی یو کے وسط میں بنائے گئے شیشے کی دیواروں والے احاطے میں ڈاکٹر اور نرسیں ڈیوٹی کے لیے موجود رہتیں۔ چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختوں سے آڑ بنا کر کیبن بنا لیے گئے تھے۔ یہ سارے کیبن سامنے سے کھلے تھے۔ ہر کیبن میں ایک بیڈ اور ایک ہی بینچ تھا جس پر دو آدمی بہ مشکل بیٹھ سکتے تھے۔ کیبن کے اندر سامنے والی دیوار پر اُوپر سے آنے والی آکسیجن

www.urduchannel.in

کی نالی اور ایک چوکور باکس میں نصب سبز لکیر اُچھالتا مانیٹر نمایاں تھا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر وہیں شیشے کی دیوار سے پرے کھڑے وقفے وقفے سے انھی مانیٹرز پر اچھلتی لکیروں کو دیکھ لیتے تھے۔

جس وقت ڈاکٹر کھسیانا ہو کر واپس ہو رہا تھا غالباً یہ وہی وقت تھا جب گھنٹوں بے سدھ پڑے رہنے کے بعد پہلی بار کامران کو اپنے ٹخنے پر پڑنے والی عالیہ کے سانسوں کی پھوار کا خوش گوار احساس ہوا تھا۔ نرم' ملائم اور بھیگی بھیگی پھوار جو اس کے اندر اس کے لہو کا حصہ ہو کر اس میں آنچ بھر رہی تھی۔

جب وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ گھر کی بہ جائے ہسپتال میں تھا اور عالیہ عین اس کے قدموں میں نہ جانے کب سے پڑی تھی تو اسے عالیہ کے وجود نے گرفت میں لے لیا جو اس کی نظر میں پوری طرح نہ آ رہا تھا۔ اس نے سر اُچک کر دیکھنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اسے گردن اُٹھانے کے لیے ٹانگوں کو قدرے دہرا کر کے زور لگانا پڑا تھا جس سے نہ صرف اس کا چہرہ اس کے گھٹنوں کی اوٹ میں آ گیا تھا' سانسوں کی پھوار کا وہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا جو اس کے اندر توانائی بھر رہا تھا۔ اس ذرا سی کوشش میں نقاہت نے اس پر بلہ بول دیا۔ وہ اتنی ہمت والا تھا کہ ایک اور کوشش کرتا مگر سانسوں کی پھوار کا یوں ٹوٹنا اسے اچھا نہ لگا تھا۔ اس ایک لمحے میں اس نے ہمکتی سانسوں سے معمور چھاتیوں والی ایسی عورتوں کو بھی دیکھا تھا جو کبھی اسے پچھاڑ دینے اور اوندھا کر رکھ دینے والی لذت کا باعث ہو جاتی تھیں مگر اب وہ اُوپر سے گرتی ہوئی لاشوں میں کہیں گم ہو رہی تھیں۔ انھی لاشوں کے ڈھیر میں اس نے اپنے آپ کو بھی دیکھا اور یقین کرنا چاہا کہ وہ زندہ تھا۔ کنٹینرز' لوگوں پر اُس کا دوڑنا' ..... گولی کا اُس کے بدن میں پیوست ہونا' عالیہ کا منھ موڑ کر لاش کی طرح پرے ڈھے جانا' سب جھوٹ تھا۔ سچ یہ تھا کہ اس کا دل دھڑک رہا تھا اس آہنگ میں جس سے اس کا تہذیبی وجود مانوس تھا۔ اس کے پاؤں پر پڑتی سانسوں کی پھوار اس کے اندر کٹ چکے احساس کی پنیری پھر سے کاشت کر رہی تھی۔ یہ کیفیت ایسا اعلامیہ تھی کہ وہ نئے سرے سے زندگی کو آغاز دے سکتا تھا۔ اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں اور ہاتھ کھسکا کر عالیہ کے گورے چٹے پاؤں پر رکھ دیا جو اس نے نیند کے عالم میں ابھی ابھی اُس کی بغل میں گھسیڑ دیا تھا۔

×××÷×××

www.urduchannel.in

بھُرکس کہانیوں کا اَندوختہ آدمی

اِدھر' یہاں میں ایک ایسے ریٹائرڈ شخص کے بارے میں گمان باندھنا چاہوں جسے اَپنے بیوی بچوں سے محبت ہو' جسے وہ بھی چاہتے ہوں مگر وہ اُن سے اِس خیال سے الگ رہے کہ یوں زیادہ سہولت سے رہا جا سکتا ہے اور خوش بھی؛ یقین جانیے' مجھ سے ایسا گمان باندھنا ممکن نہیں رہتا۔ جس ماحول میں' مَیں پلا بڑھا ہوں اور جس ماحول میں میری نفسیات مرتب ہوئی ہیں' اُن میں بس ایسے گھر کا ہی تصور موجود ہے؛ جو محبت بھری آوازوں اور چہکار سے لبالب بھرا رہتا ہے۔ جس میں خوب کھینچا تانی اور تُو تکار ممکن ہے۔ جس میں دوسروں پر اپنا اپنا حق جتلایا جاتا ہے' حق دِیا جاتا ہے اور لیا جاتا ہے۔ میرے گمان میں ایک کام یاب ریٹائرڈ آدمی وہی ہے جو بعد میں ایک بادشاہ کی طرح گھر کا سربراہ رہے' چاہے علامتی طور پر سہی۔

اور جو ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی بیوی سے اور بچوں سے الگ ہو رہتا ہے' اِس خیال سے کہ یوں خوش رہا جا سکتا ہے' اِسے میری نفسیات کی کجی کہیے کہ میں ایسے بوڑھے شخص کو خبطی سمجھنے لگتا ہوں۔ سترا بہترا۔ یا اس کے بیوی بچوں میں نافرمانی اور ناخلفی کے آثار تلاش کر کے انھیں دوزخ کا اِیندھن سمیٹنے والا گردانے لگتا ہوں۔

مگر یوں ہے کہ چالیس' بیالیس سال پہلے' اُدھر سات سمندر پار جانے والا ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے اِسی چلن کو وتیرہ کر لیا ہے اور میری نفسیات کو تہ و بالا کر کے مجھے یقین بھی

دلا دِیا ہے کہ یوں خوش رہا جا سکتا ہے۔

جی' میں کسی اور شخص کی بات نہیں کر رہا' اُس کی بات کر رہا ہوں جو کہیں اَب آ کر مجھ پر رفتہ رفتہ کھل رہا ہے' یوں جیسے آپ ایک ایسی خوب صورت مجلد کتاب کو دیکھتے ہوں جس کے سارے ہی اوراق سادہ رہ گئے تھے یا اس میں کہیں کوئی تحریر ہے بھی تو اتنی بے ضرر کہ آپ اُسے پڑھتے ہیں تو آپ کے اندر کوئی اُتھل پتھل نہیں ہوتی۔ دِل جہاں ہوتا ہے' عین وہیں رہتا ہے۔ نگاہیں سطروں کے عقب میں جھانکنے کو بے قابو نہیں ہوتیں کہ جو کچھ ہے سامنے دھرا ہے' اُس منظر کی طرح جسے آپ روز دیکھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ کل رات تک میں اُسے یوں ہی بے ضرر اور سیدھا سادا آدمی دیکھتا اور سمجھتا رہا ہوں۔ کچھ سال پہلے اُس نے جب مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ اُدھر باہر اکیلا رہتا ہے' اور خوش رہتا ہے۔ نہ صرف مطمئن ہے' اُس کی بیوی اور بچے بھی یوں رہنے پر خوش ہیں' تو یوں ہے کہ پہلے پہل میں بوکھلا ہی گیا تھا۔ مگر جب وہ اپنی بات کہہ کر اُٹھا تھا اور میں نے پلٹ کر صوفے کے اُس خالی حصے کو دیکھا تھا' جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھا ہوا تھا تو مجھے وہاں سے ایک مستغنی اور مطمئن شخص کی مہکار اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

وہ اس عرصے میں لکھنے لگا تھا۔ جاتے جاتے مجھے اپنی دو نئی کتابیں تھماتا گیا۔ ایک میں بقول اس کے کہانیاں تھیں اور دوسری میں ہائیڈ پارک کی دُنیا بسی ہوئی تھی۔

پہلے میں نے اُس کی یادداشتوں کی کتاب پڑھی اور پھر دوسری کتاب کی چند ابتدائی کہانیاں۔ مجھے دونوں کا ذائقہ ایک سا لگا۔ یادداشتوں کو کہانی کی طرح بنا دِیا گیا تھا جب کہ کہانیوں کے متن سے یادداشتیں جھلک دے رہی تھیں۔ میں نے ان تحریروں سے اُسے سمجھنا چاہا تو وہ ویسے کا ویسا ہی رہا' جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ ایئرپورٹ کے قریب' اَپنی بیوی سے الگ اور اپنے بیٹے اور بیٹی سے دور چھوٹے سے گھر میں اکیلا' مگر خوش رہنے والا۔ اپنی کتابوں کے ساتھ' بل کہ ان کے نشے اور ترنگ میں یا پھر چیزوں پر' دیواروں اور دروازوں پر یہاں وہاں سے گرد کے ذرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر انھیں جھاڑنے اور اس مصروفیت سے اُوب کر کچن میں گھس جانے

www.urduchannel.in

والا اور پہروں وہیں گزار دینے والا۔

پہلی کتاب میں دوسری کتاب کا متن ملانے کے بعد میں جان گیا ہوں کہ وہ ہیز مڈل سیکس سے ہائیڈ پارک کی طرف تواتر سے نکلتا رہتا ہے۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر' کچھ بس میں اور کچھ ٹیوب میں کرتا ہے۔ اور یہ سفر محض اس لیے کرتا ہے کہ اُسے وہاں سرپن ٹائن جھیل تک جانا ہوتا ہے۔ اُپنی مخصوص جگہ ڈیک چیئر پر اپنے طریقے سے بیٹھنے کے لیے۔ وہ ادھر اُدھر چائے کے تھرمس اور کھانے پینے کی اشیا کو سلیقے سے رکھ کر اپنے بیگ سے رائٹنگ پیڈ' قلم اور کیمرے کو نکال کر یوں بیٹھ جاتا ہے جیسے مچھلیوں کا کوئی شکاری پانی میں کانٹا ڈال کر بیٹھ جایا کرتا ہے۔

یہ جو میں نے کانٹا لگا کر بیٹھنے کی بات کی ہے تو یوں ہے کہ اُسے وہاں اجنبی اور سیاح لوگوں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ بل کہ مجھے صاف صاف کہنا چاہیے کہ فی الاصل اُسے بات نوجوان سیاح لڑکیوں ہی سے کرنا ہوتی ہے۔ افریقی لڑکیاں ہوں یا فلپینو' ایرانی ہوں یا چینی' سویڈیش' پولش' عراقی' اٹالین یا کوئی لڑکیاں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' کہ وہ سب سے ملتا ہے۔ کوئی دُبلی پتلی اور اُونچے قد والی ہوتی ہے تو کوئی بھرے ہوئے جسم اور چمکتی تنی ہوئی جلد والی' کسی کو اُنگریزی نہیں آتی' کسی کو ملازمت نہیں مل رہی' کسی کو اس کا چاہنے والا چھوڑ گیا ہے: وہ سب سے ملتا۔ لگ بھگ ہر باریوں ہوتا کہ اُسے ہی بات کو آغاز دینا ہوتا ہے۔

اس معاملے میں عمر بھر کا تجربہ اس کے پاس ہے۔ وہ یہ گُر بھی سیکھ چکا ہے کہ اُسے کسی کی توجہ کیسے حاصل کرنا ہوتی ہے۔ ایک بار بات شروع ہو جاتی تو وہ چاہتا ہے کہ اس ملاقات میں سے ایک اور ملاقات کو نکالا جائے۔ اس کا حیلہ اُس نے پہلے سے کر رکھا ہوتا ہے۔ اُس کے پاس ایک کیمرہ ہوتا ہے' بقول اُس کے ڈیسپوزایبل کیمرہ۔ وہ چاہتا ہے کہ دوسرا زوم لینز والا اور اعلیٰ کوالٹی کا کیمرہ رکھے مگر اس نے اس سستے کیمرہ کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ کوئی تصویر بنانے پر برہم ہو جائے اور کیمرہ چھین لے تو نقصان پی لینے کی حد میں رہے۔

جب اتنے جتن سے ایک بار بات شروع ہو جاتی ہے تو وہ ہمت کر کے اُن کی

تصویریں بھی لے ہی لیتا ہے۔ جو اُسے پتا لکھوا دیتی ہیں انھیں ان کی تصویریں پوسٹ کر دی جاتیں اور جس سے یہ ایک بار پھر ملنا چاہتا ہے' اُسے ٹیلی فون کر کے بتاتا ہے: وہ اُس کی تصویریں لے کر فلاں دن اور فلاں وقت پر ہائیڈ پارک پہنچے گا۔ آؤ' ملو اور لے جاؤ۔

یہ لڑکیاں' یہ جوان لڑکیاں' یہ یہودی' عیسائی' لادین لڑکیاں سب تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا وقت بانٹ لیتی ہیں۔

ان میں سے ایک تو ایسی ہے جس نے لگتا ہے اس کا دل ہی اُچک لیا ہے۔

اگر میں اُس کی تحریروں کو اس کے کیمرے سے لی گئی تصویروں سے جوڑنے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تو دل مختی میں لینے والی ہائیڈ پارک میں اُسے ملنے والی یہ وہی چینی شہزادی ہے جس کی تصویر دکھاتے ہوئے اس کے گالوں میں تھرتھری سی دوڑ گئی تھی۔ اس نے اس تصویر کو اپنی کتاب کے فلیپ کی زینت بھی بنا دیا ہے۔

جب تک تصویر میرے ہاتھ میں رہی' وہ ایک الگ سی کیفیت میں رہا۔ ایک لطف کے احساس کے ساتھ وہ مجھے اطلاع دے رہا تھا کہ اسے ڈھنگ سے انگریزی نہیں آتی تھی۔ یہ کوئی ایسی خبر نہیں تھی جس میں اس کے لطف کو تلاش کر پایا تھا۔ ناقص انگریزی کی وجہ سے اسے وہاں نوکری نہیں مل رہی تھی۔ جس لڑکی کا قصہ سنایا جا رہا تھا وہ دل برداشتہ تھی مگر کہانی سنانے والا اُس کے دُکھ سے کہیں زیادہ ایک لڑکی کی تصویر سے اُٹھتی اُس عجب سی مہک سے جزا ہوا تھا' جس کا بہ ظاہر کوئی وجود نہ تھا مگر وہ وہاں سارے میں تھی۔ کچھ اس طرح جیسے وہاں اس لڑکی کی تصویر نہ تھی اس کا زندہ وجود تھا' مہکتا ہوا۔

مجھے اس لڑکی سے ایک دل چسپی سی ہو چلی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے اس کی کتاب میں اس لڑکی کا ذکر تلاش کر لیا۔ اور ایسا جملہ بھی جس کے مطابق وہ دُنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ میں نے کتاب کے فلیپ والی تصویر کو ایک بار پھر دیکھا۔ پھینی ناک' قدرے چوڑی پیشانی' اُبھرے ہوئے گال' جو آنکھوں تک اچھل کر انھیں دبا رہے تھے۔ یقیناً اس لڑکی کا رنگ گورا ہو گا مگر کیا اسے حسین لڑکی کہا جا سکتا تھا؟

www.urduchannel.in

میں بہت دیر تصویر دیکھتا رہا حتیٰ کہ مخمصے میں پڑ گیا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ اس کی کہانیاں اور یادداشتیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں اور دونوں اسے ایک بے ضرر انسان کی صورت دیتی ہیں' سوائے اس مقام کے' جہاں وہ پھینی ناک اور اچھلتے گالوں والی دنیا کی حسین ترین لڑکی بن جاتی ہے۔

میں نے اس کی چند ابتدائی کہانیوں کو پڑھ کر کتاب ایک طرف رکھ دی تھی۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ میری بیوی کہانیوں کی یہ کتاب اُٹھائے اُٹھائے میرے پاس آئی اور ایک شوخ سی ہنسی کے فوارے کو بہ مشکل ہونٹوں پر روکتے ہوئے کتاب کے دو تہائی اوراق دائیں ہاتھ پر اُلٹاتے ہوئے پوچھا:

''کیا تم نے یہ کہانی پڑھی ہے؟''

میں نے کتاب کی طرف دیکھے بغیر اُس سے پوچھا:

''کون سی کہانی؟''

''ارے بابا یہ۔''

اُس نے کتاب میری آنکھوں کے سامنے اُچھال کر سامنے رکھ دی۔ میرے سامنے اس کا افسانہ ''سہاگ رات'' پڑا ہوا تھا۔ اس افسانے تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے اُوب کر کتاب بند کر دی تھی۔ میں نے اُس کی جتنی بھی کہانیاں پڑھیں' لگ بھگ ہر کہانی میں وہ واقعات کو ایک شریف آدمی کی طرح ایک عام سی ترتیب میں بیان کرتا نظر آیا۔ میں نے اس کہانی پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے انتہائی بے ضرر آدمی قرار دے ڈالا تھا۔ ایسا بے ضرر آدمی' جو واقعات تو لکھ سکتا تھا اور شریفانہ کہانیاں بھی' مگر وہ انھیں تخلیق پارے نہیں بنا سکتا تھا۔ شریفانہ کہانیوں میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ پڑھتے ہی کُھل جاتی ہیں۔ اِس قبیل کی ایک سی کہانیوں کو پڑھتے چلے جانا' بتاشوں کے بعد کھانڈ کھانے کے مترادف تھا۔ تاہم میری بیوی کے پیٹ سے ہنسی کا فوارا چھوٹا تو میں اس کہانی کو پڑھنے کی طرف مائل ہو گیا۔

کہانی کے آغاز ہی میں بتا دیا گیا کہ یہ ایک ایسے خان کی کہانی ہے جو اب اس دنیا

میں نہیں ہے۔ جو بہت شریف تھا اتنا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اسے اچھے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسے میری محسوسات کا شاخسانہ سمجھئے یا پھر کہانی کے اسلوب کا معاملہ کہ میں کہانی کے خان کو کہانی کے مُصنف کے وجود کا حصہ سمجھنے لگا تھا۔ اس افسانے میں خان کی جوانی کا قصہ ایک راوی کی زبانی بیان کیا گیا تھا۔ کہانی کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ راوی نے خان کو طیش اور ترنگ میں لا کر یہ قصہ گہ ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا تاہم خان نے اپنی کہانی سنانے سے پہلے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ لوگ اگرچہ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ وہ اپنی مردانہ کمزوری کی وجہ سے شادی نہیں کر رہا مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ لوگ غلط قیاس لگاتے تھے۔ مصنف نے یہ جملہ اس اہتمام اور ایسے ڈھنگ سے لکھا تھا کہ پڑھتے ہوئے ذہن نشین رہتا تھا۔

اس کے بعد کہانی طوائف کے کوٹھے تک پہنچنے میں دو دن لگاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر رُکتی نہیں کہ اسے خان جی کو مرد ثابت کرنے کے لیے بقول افسانہ نگار ''وہ کام'' بھی کرنا پڑتا ہے۔ کہانی میں کئی ایسے موڑ آئے جن کو اختصار کے پردے میں چھپایا جا سکتا تھا مگر طول نویسی کی ہوس میں مبتلا یہ لکھنے والا سب کچھ کھول کھول کر بیان کرتا چلا گیا ہے۔

اب مجھے اپنی بیوی کے ہنسے چلے جانے کی وجہ سمجھ آ گئی ہے۔

جب یہ کہانی لکھنے والا مجھے ملنے آیا تھا تو وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر اُس سے اُس کی زندگی کے دلچسپ قصے سنتی رہی تھی۔ اسی نشست میں اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اُس کی پہلی شادی یہاں اپنے وطن میں ہوئی تھی۔ جب دلہن کو لے کر بارات واپس آ رہی تھی تو اُسے برقعے میں سر سے ٹخنوں تک لپٹی دلہن کی سرخ جوتیوں سے جھلکتے گورے گورے پاؤں دیکھ کر یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ باقی لوگ بھی اس کے پاؤں دیکھ رہے ہوں گے۔ میری بیوی نے یہ سنا تو ہنس کر کہا تھا:

''ہماری مائیں بھی کچھ اسی طرح دلہنیں بنی تھیں۔''

میری بیوی کی بات سن کر وہ ہنس پڑا اور بتایا:

''اب میری دوسری بیوی جاب کرتی ہے۔ میری بیٹی بھی خود کفیل ہے۔ پہلے پہل وہ رات دیر سے آیا کرتی تھی تو میں پریشان ہو جایا کرتا تھا' مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ اُن کی اپنی زندگی

www.urduchannel.in

ہے اور میری اَپنی۔''

لگتا ہے میری بیوی بھی میری طرح اُسے بے ضرر آدمی سمجھتی رہی ہے۔ تبدیل ہوتی دنیا کے ساتھ بدل جانے والا آدمی۔ بدل جانے والے اپنوں کے لیے اَپنی محبت اور اپنے جذبے سرنڈر کرنے والا۔ تو یوں ہے کہ اس کو ٹھے والی کہانی کے بعد ہم دونوں کے لیے وہ آدمی جو بے ضرر تھا' بے ضرر اور نحس نہ رہا تھا۔

اسے میری محسوسات کا شاخسانہ کہیے کہ اس میں موجود تبدیل ہو چکے آدمی کے ساتھ ہی اس کی کہانیوں اور یادداشتوں نے بھی اَپنی جون بدل لی ہے۔ اب ہائیڈ پارک کی لڑکیاں صرف وقت گزاری کا حیلہ نہیں ہیں۔ اس کی ایک کہانی' جس کا عنوان ''رانی'' رکھا گیا ہے' مجھے بتا رہی ہے کہ میاں بیوی کی محبت کا تقاضا کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ وہ ایک دوسرے کو محسوس کریں اور پاس پاس رہیں۔ ایک اور کہانی میں بیٹی کو ایسی زنجیر بنی رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے جو ماں باپ کو جوڑنے کا کام سرانجام دیتی رہے۔ کچھ کہانیاں چھوڑ کر ایک ایسی کہانی آتی ہے جس میں منھ پھٹ اور تلخ لڑکیوں کو سمجھایا گیا ہے کہ کوئی بزرگ اَپنی تنہائی بانٹنے کے لیے اُن کے پاس آئے تو انھیں اپنی تلخیوں کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے۔ خاندانی ڈھانچے' نامی کہانی میں اس خاندانی نظام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس میں ایک دوسرے کو خوش رکھنے کے لیے قربانیاں دے چلے جانے کی روایت ملتی ہے۔

لیجیے' میری بیوی نے مجھے ایک ایسی کہانی پڑھا دی ہے کہ اَپنی بیوی بچوں کی خوشی کے لیے ان سے الگ رہنے والا آدمی کہیں پیچھے رہ گیا ہے اور ایک ایسا شخص میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے جو زندگی اور اپنوں سے مل بیٹھنے کی تابناک سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ بالکل ویسا ہی' جیسا کہ' میری اَپنی حسی تربیت نے بالعموم رشتوں میں بہت اندر تک جڑے ہوئے تہذیبی آدمی کا ہیولا بنا رکھا ہے۔

تو پھر وہ بااعتبار اور آزاد آدمی کہاں ہے جو ادھر ہائیڈ پارک میں تھا۔ رنگ رنگ کی جواں سال لڑکیوں سے چُہلیں کرنے والا اور اُن کے بدنوں کی خوشبو سے اَپنی سانسوں میں

مہکار بھرنے والا۔ اس پر تو وہ آدمی حاوی ہو گیا ہے جس کی برقعے میں لپٹی دُلہن کی جویتوں سے جھلکتی جلد اُسے بے چین کرتی تھی۔ قدم قدم پر رشتے تلاش کرنے والا قدیم اور متروک آدمی۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ آدمی ایک مُدت سے وہاں تھا۔ چوں کہ یہ کوئی کہانی نہیں ہے لہٰذا اس میں قباحت نہیں ہے کہ آخر میں ایک سوال رکھ دیا جائے اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر آج کا آدمی مکمل طور پر ان رشتوں سے اندر سے بھی کٹ گیا جنھیں وہ باہر تلاش کرتا پھر رہا ہے تو پھر کہانی کا چلن کیسا ہو جائے گا؟

××÷××

www.urduchannel.in

کہانی کیسے بنتی ہے

وہ میرے پاس آئی اور مجھے کُرید کُرید کر پوچھنے لگی:

''کہانی کیسے بنتی ہے؟''

مجھے کوئی جواب نہ سوجھ رہا تھا کہ میرا سیل میری مدد کو آیا۔ گاؤں سے فون تھا:

''سیموں مر گئی۔''

''کون سیموں؟''

میں نے اپنے وسوسے اوندھانے کے لیے خواہ مخواہ سوال جڑ دیا۔ حالاں کہ ادھر ہمارے خاندان میں ایک ہی سیموں تھی۔

''جی بالے کی بیوی۔''

اِطلاع دینے والے کی ہچکی بندھ گئی۔

ابھی تک مجھے بھی یقین نہ آیا تھا۔ اُس کے مرنے کے دِن تو نہ تھے۔ چھوٹے چھوٹے چار بچے تھے۔ اِتنے چھوٹے کہ جنھیں ممتا کے گھنے سایے کی اشد ضرورت تھی۔

''وہ کیسے مر گئی؟''

میری آواز بھی رندھا گئی۔ اطلاع دینے والے کی سانسیں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور

پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

آج دوسرا دن تھا کہ ایسی جگر چیر نے والی خبریں سننے کو مل رہی تھیں۔ کل صبح میں ابھی گھر سے دفتر لے لیے نکلا ہی تھا کہ سامنے رہنے والی نائلہ کے متنے سے پیارے بیٹے ارباز کو ایک نو دولتیے کی نابالغ اولاد نے ویلنگ کرتے ہوئے ٹکر ماردی تھی۔ میں اُسے بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ میرے بازوؤں میں مچھلی کی طرح تڑپا اور دم توڑ گیا تھا۔ جب میں اس کی لاش اُس کی ماں کی گود میں ڈال رہا تھا تو میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت اپنے دل میں نہ پاتا تھا حالاں کہ جب سے اس کا شوہر اسے چھوڑ گیا تھا اسے چوری چھپے دیکھنا مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔

کل ہی دفتر میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر محبت سے باتیں کرنے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے طاہر خان کو ویگن نے کچل ڈالا تھا۔ وہ سڑک پر دیر تک تڑپتا رہا۔ گاڑیاں اُس کے پاس سے گزرتی رہیں۔ تھانہ کچہری کے چکروں سے بچنے کے لیے کوئی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ ہمارے دفتر کے نفیس کی نظر اُس کے کچلے ہوئے بدن پر پڑی۔ نفیس اُسے ہسپتال لے گیا۔ مگر بہت دیر ہو گئی تھی۔ رگوں سے سارا خون نچڑ چکا تھا۔

سب دُعا کرتے رہے مگر وہ مر گیا۔

ایک نوخیز شاعرہ شہ بین کچھ دنوں سے ہمارے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے بے ریا محبت کی کچی نظمیں ہی لکھنا سیکھی تھیں۔ کل شام اُس نے محبت کی اُداس کر دینے والی ایک نظم ہمیں سنائی تھی۔ یوں کہ ہم دیر تک کچھ کہہ نہ پائے تھے۔ اس نے اپنی ساری نظمیں سمیٹ کر پرس میں ڈال لیں اور چپکے سے باہر گلی میں قدم رکھ دیا۔ باہر موت تاک میں بیٹھی تھی۔ دو موٹر سائیکل سوار نو جوانوں نے ادھر اُدھر آ کر اُس سے پرس چھننا چاہا۔ وہی پرس جس میں اس کی نظمیں تھیں۔ اُس نے مزاحمت کی اور اُسے گولی ماردی گئی۔

www.urduchannel.in

زخمی حالت میں ہم اُسے ہسپتال لے گئے۔ بہت ساری دعائیں کیں مگر وہ بھی مرگئی۔

مجھے اُپنی دعاؤں کے قبول نہ کیے جانے کا دُکھ تھا۔ رات سونے سے پہلے میں نے موت کے تین چہرے کا عنوان جما کر ایک نظم لکھ ڈالی تھی:

''یہ کیسی پت جھڑ ہے کہ اے مالک، کسی دعا کی شاخ پر قبولیت کی کوئی کونپل نہیں پھوٹتی۔

اے جہانوں کو پالنے والے ایک ننھی مُنّی جان کے لیے آخر کتنا رزق درکار ہوتا ہے۔

اے دلوں کو محبت کے نور سے منور رکھنے والے' ایک محبت کے چراغ کو روشن رکھنے کے لیے زندگی کے کتنے ایندھن کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

اے حرف میں معنی اور معنی میں تاثیر رکھنے والے' نازک جذبوں کو کومل لفظوں میں ڈھالنے والی کی کل کائنات تمہاری اتنی بڑی کائنات سے بڑی تو نہ ہوسکتی تھی۔''

میں لکھتا رہا...... حتیٰ کہ یہ تین اموات کا دُکھ اس نظم میں سما گیا۔ اتنا بڑا دُکھ جو تین گھروں میں نہ سما رہا تھا' میری اکلوتی نظم ڈکار گئی تھی اور میں صبح معمول سے جاگا تھا۔

مگر آج صبح ہی صبح مجھے اندر سے ایک بار پھر یوں اُدھڑنا تھا کہ کئی نظمیں لکھ ڈالتا تو بھی دِل کو واپس ٹھکانے پر نہ لاسکتا تھا۔

بات کرنے والا سسکیاں لے کر خاموش ہوگیا۔ پھر سیل کا روشن ڈسپلے بھی بجھ گیا مگر میں مسلسل اُسے دیکھ رہا تھا۔ جتنی دیر تک میں سیل کو دیکھتا رہا' وہ مجھے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے اُپنے سامنے کہانی کو بنتا دیکھ رہی ہو۔

×÷×

جب میں گاؤں جا رہا تھا تو میں اُس کا سوال بھول چکا تھا۔

بالے کے گھر کے باہر لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ سب ہی دُکھ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گھر کے اندر سے عورتوں کے رونے اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں دُکھ میں ڈوبے لوگوں کو چیرتا دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اندر سے آنے والی چیخوں سے میں نے ایک مانوس آواز کو صاف الگ کرلیا۔ یہ مرنے والی کی ماں تھی:

''سوجھا'نی مینڈ جیے دِ جیے توں تاں لمے پینڈے پے گئی ایں انج نئیں کریدا۔''

(دھیان، اے میری بیٹی کہ تم نے تو طویل مسافت اختیار کرلی ہے۔ ایسا تو نہیں کرتے)

جوں ہی بین کا ایک ٹکڑا مکمل ہوتا' عورتوں کی چیخیں نکل جاتیں۔

جب میت اُٹھا کر باہر لائی گئی تو مردوں کی چیخیں بھی نکل گئیں۔

میت والی چارپائی کو ایک طرف سے سیموں کے سر شیفے نے کندھا دِے رکھا تھا اور دوسری طرف اس کا شوہر بالا تھا۔

بالے نے شیفے سے جوئے میں بھینس جیتی تھی لیکن اسے بدلے میں پیاری سی لڑکی مل گئی تھی۔ یہ اُس کی دوسری بیوی تھی۔ مگر گھر میں گھستے ہی بالے کو پہلی سے زیادہ عزیز ہوگئی تھی۔ اب تو اُس کا گھر اس ہی کے نصیبوں سے محبت کا گہوارہ تھا۔ جب دونوں کندھا دے کر چارپائی گھر سے نکال رہے تھے تو سیموں کی ماں کے بینوں اور عورتوں کی چیخوں میں کوئی آہنگ نہیں رہا تھا۔

جب میں کندھا دینے کے لیے چارپائی کی دائیں جانب گھوم کر بالے کے قریب ہو گیا تو مجھے یوں لگا جیسے مرنے والی کی ماں کے بین یک لخت تھم سے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ یکا یک اس نے عارضی خاموشی توڑ دی اور پہلے سے کہیں زیادہ درد بھری آواز میں بین کرتے ہوئے اُپنی بھاری چھاتیاں تھپا تھپ پیٹ ڈالیں:

''توں دِل لائیا سی حیاتی نال چپ چپیتے۔
لمیاں چپاں تینوں موت جئے روگ دِتے۔
سوجھانی مینڈ جیے دِ جیے تینوں کندھا دِین اپنے آگئے نیں۔
انج نئیں کریدا۔''

www.urduchannel.in

(تم نے چپکے چپکے زندگی کے ساتھ دِل لگایا تھا۔ لمبی چپ نے تمھیں موت جیسے روگ دِیے دِھیان' اے میری بیٹی کہ تمہاری میت کو کندھا دینے والے تمھارے اپنے آ پہنچے ہیں ۔ایسا تو نہیں کیا جاتا۔)

کہتے ہیں بالا' اَب پہلے جیسا اُکھڑ اور بدمزاج نہیں رہا تھا۔ سیموں نے اُسے بدل کر رَکھ دیا۔ بدلے ہوے بالے نے رو رو کر اَپنی آنکھیں سرخ بیرا بنالی تھیں۔

گاؤں کا ہر شخص میت کو کندھا دِینے کے لیے یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے یہ بالے کی سیموں کا نہیں اس کی اَپنی بیٹی کا جنازہ تھا۔

جب میں اپنا کندھا کھسکاتے کھسکاتے چارپائی کے پچھلے پائے سے ٹکرا کر جنازے کے عقب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مرحومہ کے بچے گم صم پیچھے پیچھے یوں چل رہے تھے جیسے اس اچانک صدمے نے انھیں کچھ سمجھنے ہی نہ دیا ہو۔ بچوں کی نانی کے بین تعاقب میں تھے:

''تتیاں دُھپاں وِچ اَپنے بالاں تے ٹھنڈی چھاں ہوں والیے مینڈ ھیے دِھیے۔
کس دِے آسرے اِنہاں نوں چھوڑ چلی ایں توں۔
انج نئیں کریدا۔''

(تپتی دھوپوں میں اپنے بچوں پر ٹھنڈی چھاؤں ہو جانے والی اے میری بیٹی اب کس کے سہارے انھیں چھوڑ کر تم چل پڑیں۔ یوں تو نہیں کیا جاتا)

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جنازے کے پیچھے گلی میں آگئی تھی۔ اُس کے بال کُھلے ہوے تھے اور سر کی چادر پیچھے گر کر گھسٹ رہی تھی۔

''ایہہ کچے کولے معصوم بن کہدی چُنی وِچ سر لکان گے مینڈ ھیے دِھیے انج نئیں کریدا۔''

(یہ نرم و نازک معصوم بچے اب کس کے آنچل کی اوٹ لیں گے اے میری بیٹی یوں تو نہیں کیا جاتا)

بین اتنے دردیلے تھے کہ دُکھ میرے پورے وجود کے اندر بھر گیا تھا۔

میت جنازہ گاہ پہنچی ۔صفیں ترتیب دی گئیں۔ جنازہ بالے کے دادا نے پڑھایا تھا۔ جب وہ تکبیر کہتا تو اُس کی آواز لڑکھڑا جاتی ۔صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب دُکھ کے شدید حملے کی وجہ سے تھا۔

دُعا کے بعد میت وہاں لائی گئی جہاں کُھدی ہوئی قبر اُسے اِپنی آغوش میں لینے کو تیار تھی ۔میت قبر میں اُتار دی گئی۔ قبر کی بغل میں چیرویں کھدائی اس طرح کی گئی تھی کہ اس کا جسم پوری طرح اس میں سما گیا تھا۔ اُوپر پتھروں کی تراشی ہوئی سلیں پہلو بہ پہلو رکھ کر چیرویں کھپتے کو پاٹ دِیا گیا۔

بالا آگے بڑھا۔ اس نے بھر بھری مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر پہلے تو قبر پر ڈالیں اور پھر اُپنے سر پر ڈال کر پاگلوں کی طرح سر پیٹنے اور چیخنے لگا۔ وہ جنازہ اُٹھنے سے لے کر میت کے قبر میں اُترنے تک یوں چپ تھا' جیسے اُس نے جتنا رونا تھا' رو چکا تھا۔ اس کا یوں اچانک پھٹ پڑنا سب کو رُلا گیا تھا۔ اُس کے باپ نے ''حوصلہ' حوصلہ'' کہہ کر اُسے اپنے بوڑھے بازوؤں میں جکڑ لینا چاہا اور پھر اَپنی ہی بات کو دہراتے دہراتے رو رو کر دوہرا ہو گیا۔

مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ جا رہا تھا۔ میرے بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''مرنے والی کا جتنا غم کیا جائے اتنا ہی کم ہے کہ اُس نے اس گھر کو مکمل تباہ ہونے سے بچالیا تھا۔ اور جو بچالیتا ہے اُس کا جنازہ اَپنے کندھوں پر اُٹھانا اور اَپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔''

میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے سوچا کیا میں چاہتا تو سیموں کے نصیب بدل سکتا تھا؟

مگر' اب جب کہ وہ زمین میں دَبا دی گئی تھی' میں نے ایسا کیوں سوچا تھا؟

www.urduchannel.in

میں نے اُپنا سر جھٹکا۔ یوں جیسے اپنا دامن جھٹک کر تب الگ ہو گیا تھا جب سب کچھ ہو سکتا تھا۔

سیموں کے مرنے کی وجہ مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ اُسے بجلی کا شاک لگا تھا۔ قبرستان سے پلٹنے کے بعد جب میں اندر زنان خانے گیا تھا تو مجھے بجلی کے وہ تار دکھائے گئے جو صحن کے اوپر سے گزارے گئے تھے۔

یہی تار ٹوٹ کر سیماں کی موت کا سبب بن گئے تھے۔

صحن میں سٹیل کا ایک تار ڈھلے ہوئے کپڑے پھیلانے کے لیے شمال اور جنوب کی دیواروں کے درمیان بندھا ہوا تھا۔ سیموں اُس پر گیلا کھیس ڈال رہی تھی کہ ایک جانب سے یہی تار کھل کر اُچھلا اور اُوپر سے گزرتے بجلی کے تاروں میں اُلجھ گیا۔

پورا کھیس بجلی سے بھر گیا تھا۔

کھیس بھی اور گیلی سیموں بھی۔

پھر وہ اُچھلی اور دیوار کی سمت سر کے بل گئی یوں کہ اُس کا سر ٹکرا کر کُھل گیا تھا۔

اور اب جب کہ میں واپس شہر آ گیا ہوں۔ اور مجھے اُس کا انتظار ہے جو یہ جاننا چاہتی تھی کہ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے؟ تو سوچ رہا ہوں کہ وہ آئے گی تو بتاؤں گا کہ حادثات کس طرح کہانی کا مواد بن جایا کرتے ہیں۔

لو وہ آ گئی ہے اور میری آنکھوں میں یوں جھانک رہی ہے کہ میں کہانی کا گُر اُسے بتانا بھول گیا ہوں۔ وہ میرے چہرے پر نظریں نکائے نکائے دھیرے سے کہتی ہے:

''میں جان گئی ہوں جی' کہ کہانی دُکھ سہے بغیر اُسے نہیں لکھا جا سکتا۔ محبت میں دُکھ۔''

وہ ایک ڈیڑھ جملہ میری طرف لڑھکا کر خاموش ہو گئی ہے۔ میں کھسیانا ہو رہا ہوں۔ وہ مستقل چپ رہتی ہے۔ یوں کہ مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب وہ کچھ بھی نہ کہے گی۔ مگر اس نے سوال جیسا جملہ میری جانب سرکا کر مجھے بوکھلا دیا ہے:

''آپ کی کہانیوں میں ایک لڑکی بار بار آتی رہی ہے
محبت کی علامت بن کر
کہیں وہ مرنے والی ہی تو نہیں ہے؟''

××÷××

پارہ دوز

(تین پارچے: ایک کہانی)

پہلا پارچہ

اُس روز تو میری آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔

بے خوابی کا عارضہ میرے لیے نیا نہ تھا تاہم پہلے میں مُسکّن ادویات سے اس پر قابو پالیا کرتا تھا' یوں نہیں ہوتا تھا کہ ادل بدل کر دوائیں لینے سے بھی افاقہ نہ ہو۔ مگر اس بار ایسا نہ ہوا تھا۔ دونوں کنپٹیوں کے نواح سے درد برامد ہو کر پورے بدن پر شب خون مارتا تھا اور میرے عصبی ریشے بری طرح ٹوٹنے لگتے تھے۔ جب سارے ٹسٹ ہو چکے اور کہیں بھی کوئی خرابی نہ نکلی تو مجھے تشویش کے دورے پڑنے لگے میں اس ٹوٹ پھوٹ سے نڈھال تھا مگر یہ درد کیوں تھا' اس کی تشخیص ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ اور یہی بات مجھے دہلائے دیتی تھی۔ بے پناہ تشویش کے ایسے ہی دورانیے میں میرا دھیان آنکھوں کی دُکھن کی جانب ہو گیا۔ بل کہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ جب سارا درد آنکھوں میں برچھی کی طرح کھب گیا تو دھیان نے وہاں ارتکاز کے علاوہ میرے پاس کوئی اور صورت تھی ہی نہیں۔

بدن کا درد تو کسی کو نظر نہ آیا تھا مگر میری ان آنکھوں کو تو دیکھا جا سکتا تھا جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

www.urduchannel.in

نافی کا خیال تھا: اس میں تشویش کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

یہ بات اس نے میری آنکھوں میں دیکھے بغیر ہی کہہ دی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی مصنوعی پلکیں چپکا رہی تھی۔ مجھے اس کے رویے پر طیش آ رہا تھا تاہم میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس پر اپنے غصے کا اظہار کیسے کروں۔ ہم دونوں کے درمیان رشتہ کچھ ایسی نہج پر پہنچ چکا تھا کہ ہم ایک دوسرے پر غصہ کرنا لگ بھگ بھول ہی گئے تھے۔

میں نے ہمت جمع کی اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا' کچھ یوں کہ اس کی نظر آئینے کی بہ جائے میری سرخ بیرابی اُبلتی ہوئی آنکھوں پر پڑ جائے۔

نافی نے کندھے سکیڑ کر پہلو بدلتے ہوئے اپنی داہنی کہنی کو قدرے باہر کو نکلی ہوئی میری توند سے بائیں جانب نکا دیا' یوں کہ آئینہ دیکھتی اس کی نیلی آنکھیں میری گردن کے ایک طرف سے بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھتی رہیں۔ میں نے بائیں کو مزید کھسک کر درمیان میں حائل ہونا چاہا تو وہ میرے ارادے کو بھانپ گئی اور "اوں ہونہہ" کہتے ہوئے میرے پیٹ پر ٹکی کہنی پر دائیں جانب دباؤ بڑھا دیا۔

میں مجبوراً ایک طرف کھسک گیا تاہم ہمت نہ ہاری اور لگ بھگ گھگھیا کر کہا "نافی دیکھو نا ڈارلنگ میری آنکھیں درد سے پھٹ رہی ہیں۔"

مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی' اتنی کہ میں اوبدا کر آئینے میں خود کو دیکھنے لگا تھا۔ ایک ثانیے کے لیے' جی محض ایک ثانئے کے لیے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھیں سرخ نہیں تھیں' مگر دوسرے ہی لمحے سارے آئینے میں سرخ لوتھڑا بنی آنکھیں اُگ آئی تھیں۔ میں نے ادھر سے دھیان ہٹا کر ساری توجہ نافی پر مرتکز کر دی کہ شاید یوں وہ آئینے کے واسطے سے میری آنکھوں پر نظر ڈال لے۔ میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا مگر وہ اپنے آپ میں بری طرح مگن تھی کچھ اس محویت سے کہ اس سلسلے کو روک کر میری طرف دیکھنے کی گنجائش نکلتی ہی نہ تھی۔ تاہم ہمارے حسی نظام کی تربیت اس نہج پر ہو چکی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھے بغیر سہولت سے ضروری فیصلے کر سکتے تھے اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ مجھے وہاں کھڑا رہنے کی بہ جائے اپنے لیے کوئی اور

www.urduchannel.in

مصروفیت ڈھونڈنی چاہیے:

''اوہ موظی ڈیئر' میں نے دیکھ لی ہیں نا تمہاری آنکھیں۔''

وہ جھوٹ بول رہی تھی یا ممکن ہے اس نے میرا چہرہ دیکھے بغیر ہی میری آنکھیں دیکھ لی تھیں تاہم میں دیکھ رہا تھا ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نگاہ اس کے اپنے چہرے سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس کے جملے پر ایک بار پھر غور کرنا پڑا' اور جب میں اسے خوب جانچ چکا تو اس کا مطلب بھی سمجھ میں آ گیا تھا۔

وہ ہمیشہ سے نچلے ہونٹ کو قدرے ڈھلا چھوڑ کر مجھے معظم کی بہ جائے موظی کہتی چلی آ رہی تھی' حتیٰ کہ ایسے کہنا اس کی عادت ہو گئی۔ تاہم ایک زمانہ تھا کہ موظی کہتے ہوئے اس کا نچلا ہونٹ رسیلا ہو جایا کرتا تھا۔ جب پہلی بار اس نے مجھے موظی کہا تو میں بہت ہنسا تھا۔ میں نے سیلاب جیسی ہنسی تھمتے ہی اس کے رسیلے ہونٹوں کے صدقے اس کا موظی کہنا قبول کر لیا تھا۔ اور جب اس نے پوچھا کہ میں اسے نفیسہ کی بہ جائے محبت سے کیا کہا کروں گا تو مجھے کچھ نہ سوجھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے نام کو بدلنے کی مجھے طلب ہی نہ ہو رہی تھی۔ میں اسے نفیسہ کہتا تھا تو اس کا پورا وجود انتہائی نفاست سے میرے سامنے ایستادہ ہو جاتا لہٰذا میں نے کہہ دیا کہ محبت مجھے نفیسہ کہنے سے باز نہیں رکھے گی۔ مگر اس نے ضد کر کے اپنے لیے نافی سے پکارا جانا تجویز کر لیا تھا۔

نافی جہاں تھی وہاں اب میرا نکلنا مشکل ہو رہا تھا مگر یوں تھا کہ میں اس کی توجہ کے لیے مرے جاتا تھا۔ اس طرح کا مرنا تو میں ایک مدت سے بھول چکا تھا۔ مگر آہ میری سرخ بوٹی جیسی آنکھیں..... میں وہاں سے کیسے ٹل سکتا تھا کہ ابھی تک اس نے ان میں جھانکا ہی نہیں تھا۔

جب وہ آئینے کے اوپر جھک کر نفاست سے بنی اپنی بھنوؤں کو دائیں ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی سے باری باری سہلا کر جائزہ لے رہی تھی تو میری دُکھتی ہوئی آنکھیں آئینے ہی سے اس کے چکنے شانے سے پھسلتی ڈیپ وی میں گر گئی تھیں۔ روئی کے گالے جیسی نرمی ان کے

لیے مرہم ہو گئی تھی۔ میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے وہاں' اُس گداز میں بھول سکتا تھا مگر عین اسی لمحے نرم اور ملائم جلد کٹتی چلی گئی' تیز نشتر کی نوک سے' بالکل ایک سیدھ میں۔ اور جب وہ پوری طرح کٹ گئی تو لہو شرانے بھر کر بہنے لگا' اتنا کہ میری آنکھیں اس لہو میں ڈوب گئی تھیں۔

دوسرا پارچہ

میرے لیے وہ پہلا آپریشن نہیں تھا۔ اس عورت کی باری آنے سے پہلے اس جیسے ٹھگ سات سو بائیس مریضوں کو چھ سال میں آپریٹ کر چکا تھا۔ ایک ایک پیشنٹ کا ریکارڈ میرے پاس تھا۔ اکثر میں اس عرصے میں کامیاب نہ ہونے والے آپریشنز کی شرح نکالتا رہتا ہوں تو وہ محض ایک اشاریہ ایک صفر آٹھ فی صد بنتی ہے۔ اس عرصے میں آپریشن کے تختے پر یا پوسٹ آپریشن ٹریٹمنٹ کے دوران مرنے والوں میں سے پانچ کی عمر اٹھاون سے اوپر تھی دو لڑکے نو اور گیارہ برس کے تھے جبکہ ایک عورت عین اس عمر میں آپریٹ ہوئی تھی جس میں اب نافی تھی۔

جس کے لہو سے میری آنکھیں بھیگی تھیں وہ مرنے والی یہ عورت نہیں تھی۔ نہ یہ باقی مرنے والی عورتیں۔ وہ عورت تو زندگی کے ایسے دوراہے میں آپریشن تھیٹر میں لائی گئی تھی جو طویل تر ہو گیا تھا' اتنا کہ کاٹتے رہنے سے بھی کٹنے میں نہ آتا تھا۔

سات سو بائیس مریضوں کے آپریشن کے چھ برس کتنی جلدی بیت گئے تھے۔ میرا اپنا دل اُس سارے عرصے میں عین پسلیوں کے بیچ نشتر چلاتے ہوئے ایک بار بھی نہیں کانپا تھا۔ جنھیں زندگی ملنا تھی' انھیں میرے نشتر کی دھار سے ملی اور جن کی سانسوں کا کوزہ ختم ہو گیا تھا انھیں میرا خلوص اور انتھک محنت بھی زندگی نہ دلا سکا تھا۔ تاہم جب میری مہارت اور قابلیت کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تو میری ڈاکٹر میر باز سے ملاقات ہو گئی۔

ڈاکٹر میر باز سے میں پہلے بھی مل چکا تھا غالباً پہلی بار ان دنوں جب وہ وفاقی

www.urduchannel.in

علاقے میں اپنا ہسپتال بنانے کا منصوبہ بنا رہا تھا ان دنوں وہ اس سرکاری ہسپتال کے سربراہ سے ملنے آیا تھا جس میں میں پریکٹس کرتا تھا۔ اُسے بہت سے امور میں میرے باس کی مدد چاہیے تھی' یہ مدد اُسے ملتی رہی ایک شاندار ہسپتال دیکھتے ہی دیکھتے بن گیا۔ جتنے سرکاری ادارے اس کے پینل پر آسکتے تھے وہ لائے گئے اور اس میں بھی میرے باس کی مدد شامل تھی۔ تاہم میں اُسے دیکھتا تھا تو مجھے اُبکائی آنے لگتی اور جب اس کے ہسپتال کے پاس سے گزرنے کا موقع نکلتا تو مرعوبیت مجھ پر چڑھ دوڑتی تھی۔ شاید یہی وہ اسباب تھے کہ میں اس کے قریب نہ ہو پا رہا تھا لہٰذا اپنے کام میں مگن ہو گیا حتیٰ کہ وہ دن آ گیا کہ جس کی شام کو ہمیں کرائے کا مکان بدلنا تھا اور نفیسہ نے' جو ابھی نانی نہیں بنی تھی' ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا کہ ہم کب تک کرائے کے مکان بدلتے رہیں گے۔ یہ بات نفیسہ نے عین اس وقت کہی تھی جب اس نے سامان گھسیٹتے ہوئے میری پُشت سے اپنی پُشت کو ٹکرا لیا تھا۔ اس ٹکرانے میں کچھ ایسا لطف تھا کہ وہ یونہی سی ایک بات سمجھ کر اپنے اس جملے کو بھول گئی تھی مگر اُس کی تلخی میرے اندر اتر گئی۔ جب وہ مزے سے اور اپنے آپ سے بے پروا ہو کر ہنس رہی تھی تو اس کی آواز کے ہلکوروں میں ایک میٹھا سا بھید چھلکنے لگا تھا۔ اس بھید میں اس کا بدن ڈوب اُبھر رہا تھا۔ میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا اور ساری تلخی بھول کر ان ہلکوروں میں خود بھی بہ گیا تھا۔

آخری پارچہ

اُسے سننا' اُس کی آواز کے ہلکوروں میں بہ جانا یا پھر اُس کے بدن کو یوں دیکھنا کہ لطف اور لذّت ساری دُکھن سمیٹ لے ایک مُدّت کے بعد ہوا تھا۔ اتنی مُدّت کے بعد کہ اب یہ اندازہ کرنے کے لیے' کہ آخری بار ایسا کب ہوا تھا' مجھے ذہن پر بہت زور دینا پڑے گا۔

ذہن پر غیر معمولی زور دیئے بغیر یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ واقعہ سرکاری ہسپتال سے الگ ہونے اور ڈاکٹر میر باز کے نئے ہسپتال میں میرے پہلے آپریشن

سے بھی پہلے کا تھا۔ جی' اس پہلے آپریشن کا جس نے ابھی ابھی میری آنکھیں خون میں نہلا دی تھی۔ بعد کے برسوں کی تعداد اور یادیں میں نے قصداً سینت سینت کر نہیں رکھی تھیں کہ انھیں سوچوں تو مجھے خود پر ویسی ہی اُبکائی آنے لگتی جیسی کبھی ڈاکٹر میر باز خان کو دیکھ کر آتی تھی۔

تاہم اس وقت میرا مسئلہ ابکائی نہیں آنکھیں تھیں جو درد سے پھٹی جا رہی تھیں۔

''دیکھو مونگی ڈیئر بہتر یہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے سو جاؤ' خود ہی آرام آ جائے گا۔''

اس نے اس بار بھی میری آنکھوں میں دیکھے بغیر یہ کہا تھا۔ جملے کی ساخت میں بہ ظاہر محبت اور تشویش تھی مگر آواز جس مخرج سے برآمد ہوئی تھی اس نے اسے سپاٹ اور سارے ممکنہ جذبوں سے عاری بنا دیا تھا۔

اس طرح بولنا اور اسی طرح کی آوازوں کو سننا اور ان کے مطابق اپنے آپ کو حرکت دینا اب ہماری زندگی کا معمول تھا۔ لہٰذا میرے لیے وہاں کھڑے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

میں گزشتہ طویل عرصے سے مختلف دوائیں چھانک رہا تھا اور کچھ ہی دیر پہلے اپنی اُبلتی آنکھوں میں قطرے بھی ڈال لیے تھے۔ مگر وہ درد جس نے میری آنکھوں کو گروی رکھا ہوا تھا، ٹلتا ہی نہ تھا۔ اور نانی کا کہنا تھا کہ مجھے آرام کرنا چاہیے۔

بیڈ پر بیٹھتے ہی میں نے زور سے خود کو پیچھے گرا دیا۔ خود کو یوں گرانے سے میں ایسی آواز پیدا کرنا چاہتا تھا جو نانی کو متوجہ کر لے مگر فومی گدے کی نرماہٹ پر میرا بدن جھول کر رہ گیا۔ اپنی اس کوشش کے بعد اس کو دیکھا۔ وہ پہلے کی طرح آئینے میں مگن تھی تاہم میں نے محسوس کیا کہ جب تک میں وہاں کھڑا رہا' وہ بھی کھڑی رہی تھی' یوں جیسے آئینہ اس کے وجود سے کھڑا تھا۔ مگر اب وہ بیٹھ چکی تھی اور آئینہ اسے جھک جھک کر جھانک رہا تھا۔

دودھ جیسی گوری گردن تک سلیقے سے تراشے ہوئے بالوں کو چھونے کے لیے جب نانی دونوں کہنیاں باہر کو اُٹھا کر ہاتھ پیچھے کو لے آئی تو ایک بار پھر میں اُبلتی آنکھوں کو

www.urduchannel.in

بھول گیا۔ اُس نے ہتھیلیوں کا رُخ اپنے گالوں کی طرف کیا دونوں ہاتھوں کی چھوٹی اُنگلیوں کو اوپر اٹھایا اور پھر انھیں لپکا کر بالوں کے نیچے گردن پر رگڑتے ہوئے باہم ملا لیا۔ اس کے سارے بال ان ننھی مُنّی انگلیوں کے اوپر جمع ہوئے گئے تھے۔ پھر اس نے یکدم ہاتھوں کو کچھ یوں جنبش دی کہ بالوں کے نیچے سے نکل آنے والی اُنگلیوں سمیت دونوں ہاتھوں کی آخری تین تین اُنگلیاں تتلی کے پروں کی طرح ہوا میں لہرا گئیں، کچھ اس ادا سے کہ باقی کی اُنگلیاں پہلے سے سمٹے سمٹائے بالوں کو دھیرے دھیرے اپنی پوروں سے بوسے دینے لگی تھیں۔

عین اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں ہلکی ہوگئی تھی۔ قمیض کی سلوٹیں اُس کے بدن کے گداز میں دھنس رہی تھیں۔ گلا آگے پیچھے دونوں طرف سے ڈیپ تھا جو اندر کی ساری نرمی باہر پھینک رہا تھا۔ بازو اُوپر اُٹھانے سے اس کے کولہے دائیں بائیں اور پیچھے کو کچھ اور پھول گئے تھے۔ اتنے کہ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ میں اٹھ کر انھیں پیار سے تھپتھپا دوں۔ میں نے اُٹھنا چاہا بھی مگر آنکھوں کی شدید چبھن نے مجھے اُٹھنے ہی نہ دیا اور وہ خواہش قضا ہوگئی۔ اتنی شدید اور اتنی خالص خواہش کے اس قدر مختصر دورانیے پر مجھے بہت دکھ ہوا۔ تاہم عین اسی لمحے پر، حیران بھی تھا۔ اور حیرت اس بات پر تھی کہ یہ خواہش میرے اندر ابھی تک موجود تھی۔ اب میں اسے دیکھتے رہنا چاہتا تھا مگر اسے یوں دیکھنا میرے لیے ممکن نہ رہا تھا کہ میرا سر گھومنے لگا۔ اور میں قبر جیسے اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ شان دار روشن قبر کے گہرے اندھیرے میں۔

جونہی میں قبر کے پیندے سے جا لگا ٹیلی فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ میں گن نہیں پایا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی کتنی بار بجی تھی تاہم آخری بار ابھی اس کی گونج پوری طرح معدوم نہیں ہوئی تھی کہ نانی کے ہیلو کہنے کی آواز سنائی دی۔ دوسری طرف جو بھی تھا اسے نانی نے یہ نہ بتایا تھا کہ میں اس کے کہنے پر آرام کر رہا تھا۔ اُس نے اگلے آدھے گھنٹے کے اندر میرے پہنچنے کا خود ہی تخمینہ بھی لگا لیا تھا۔ بات مکمل کرتے ہی اس نے مجھے جھنجھوڑ ہی ڈالا تھا اتنی زور سے کہ اتنا جھنجھوڑنے

پر مُردے بھی زندہ ہو سکتے تھے۔

وہ آپریشن ڈے تھا اور مجھے اُوپر تلے تین آپریشن کرنا تھے۔

جب میں تیار ہو کر اپنے خوب صورت گھر کے پورچ سے اپنی نئی گاڑی نکال رہا تھا تو نہیں جانتا تھا کہ ایک مرا ہوا شخص زندگی کے بخیے کیسے لگا پائے گا۔

××÷××

www.urduchannel.in

تھوتھن بھنورا

شام پڑتے ہی اندھیرا سارے گھر میں تہ بہ تہ جمع ہونے لگا ہے۔ وہاں جہاں ٹرالی پر ٹی وی پڑا ہے۔ اس کے سامنے بچھے ایرانی قالین پر۔ دائیں جانب' جہاں ٹیک لگا کر بیٹھنے کے لیے ملتانی ٹانکے والے کشن پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہاں اس بڑے صوفے پر' جس کے وسط میں میرا خوف سے نچڑا ہوا وجود پڑا ہوا ہے۔

اوہ' یہ نرا خوف نہیں ہے جو مجھے نچوڑ رہا ہے' ایک عجب نوع کی بے کلی اور شدید گہرے دُکھ کا احساس بھی اس میں شامل ہو گیا ہے۔

ہاں تو میں اس اندھیرے کی بات کر رہی تھی' جو میرے اِدھر اُدھر سے بہتا ہوا آتا ہے' اوپر کی منزل کو جاتی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکتا ہوا' تہ خانے میں اُترتے راستے سے اُبلتا ہوا۔ یہ سارے کا سارا اندھیرا میرے وجود پر جمتا چلا جاتا ہے۔ میں ایک ایک کر کے گھر کے سارے قمقمے روشن کر دیتی ہوں۔ وہ میری ٹانگوں سے چپک کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنا چاہتی ہوں' مگر وہ مجھے نظر نہیں آتا۔

''شینا' شینا''

''جی امی جی''

''دیکھ تھوتھن بھنورا' تیری ٹانگوں میں گھس رہا ہے۔''

میری ماں نے اس ننھے منے کتے کا نام تھوتھن بھنورا شاید اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ اس کے روئی جیسے لمبے بالوں کے اندر اس کی گردن غائب ہونے کی وجہ سے سیاہ تھوتھنی قدرے زیادہ نمایاں ہو گئی ہے اور وہ مجھے دیکھتے ہی بھنورے کی طرح میرے اِدھر اُدھر چکر کاٹتا رہتا ہے۔

جب بھی میری ماں، میرے اس لاڈلے کتے کا نام لیتی' تو اتنا سنوار کر اور اہتمام سے لیتی کہ میں ماں کے شفیق چہرے کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔

میں ماں کو دیکھ رہی ہوں مگر جھک کر' تھوتھن بھنورے کو بھی چھونا چاہتی ہوں۔ وہ اپنی تھوتھنی اُٹھا کر میری اُنگلیاں چاٹنے لگتا تو میں تھوتھنی کے گیلے پن سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ کھینچ لیتی ہوں۔ اسے میرا اُنگلیاں ہتھیلی میں سمیٹ کر یوں ہاتھ اوپر اُٹھا لینا ناگوار گزرتا ہے۔

میں اب بھی ماں ہی کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے ہوں تاہم مجھے فوراً اس کے اپنے آپ میں سمٹنے کی خبر ہو گئی ہے۔ اس کی بالوں بھری پیٹھ' جو میری ٹانگوں سے رگڑ کھا رہی تھی' الگ ہو گئی ہے۔ اس نے پل بھر میں اپنا بدن سمیٹ لیا ہے۔ یہ بھی اس کے ناراض ہونے کی ایک ادا ہے۔ میں چونک کر اپنی ٹانگوں میں اسے دیکھتی ہوں۔ وہاں' جہاں ابھی ابھی وہ تھا۔ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں گھبرا کر ٹانگوں کے آس پاس نگاہ دوڑاتی' اور عقب میں بھی کہ بالعموم وہ میرے پیچھے چھپ جایا کرتا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں ہے۔ میں باہر دروازے کی طرف دیکھتی ہوں تو ایک سایہ سا باہر کی جانب لپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میں بھی ادھر لپکتی ہوں اور کیا دیکھتی ہوں کہ سیاہ تھوتھنی اجالے کو چیر کر باہر نکل گئی ہے اور ریشمیں اجلی پیٹھ وہاں پھنسے اجالے میں تحلیل ہو گئی ہے۔ میں بوکھلا کر اسے پکارتی ہوں۔

''تھوتھن بھنورے' تھوتھن بھنورے۔''

مجھے ماں کی طرح اس کا پورا نام لینے میں دقت ہوتی ہے تو اس کا نام مختصر کر لیتی ہوں:

''بھنورے بھنورے''

''شینا' شینا''

''بھنورے.....''

''شینا.....''

کب سے آوازیں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ میں لحاف کے اندر ہی اندر کسمساتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے ایک دروازہ ہے جو چوپٹ کھلا ہے اور اس کی چوکھٹ کے سارے احاطے میں آنکھوں کو چندھیا ڈالنے والی گاڑھی دھوپ پھنسی ہوئی ہے۔ یوں، جیسے اسے چوکور کاٹ کر وہاں ٹھونس ٹھانس کر پھنسا دیا گیا ہو۔

بھنورے.....

میں آواز پھینکتی ہوں۔ دھوپ کی دیوار اسے لوٹا دیتی ہے۔

''شی.....نا.....''

میرے عقب سے آواز آتی ہے اور ٹوٹ کر اندھیرے میں گر جاتی ہے۔

میں چندھیائی آنکھوں سے دیکھتی ہوں اور مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

رفتہ رفتہ میری آنکھیں دبیز اندھیرے سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ اب میں منھ سے لحاف اُلٹے بغیر اندازہ لگا لیتی ہوں کہ ابھی آدھی سے زیادہ رات باقی پڑی ہوئی ہے۔ میں پہلو بدلتی ہوں، منھ پوری طرح کھول کر لمبے لمبے سانس لیتی ہوں اور انھیں ناک کے راستے آہستہ آہستہ اور روک روک کر خارج کرتی ہوں۔ بار بار ایسا دھرانے سے میں نیند کو اپنی جانب راغب کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں۔

''شینا شینا''

ماں مجھے پاؤں کے سمت کھڑا ہو کر جگایا کرتی۔

وہ دھیرے دھیرے میرا نام لیتی، یوں جیسے سرگوشی کر رہی ہو یا یوں جیسے وہ اپنے حلقوم سے نکلے ہوئے میرے نام کو ہونٹوں سے ٹٹول رہی ہو۔ یہ آواز ہر بار میری سماعتوں میں رسیلی گدگدی کی طرح اُترتی ہے۔ گدگدی کی طرح بھی اور لوری جیسی بھی۔ کہ میں ہر بار لحاف کے اندر ہی اندر کسمسا کر رہ جاتی ہوں۔ اور جب تک میری آنکھوں کے پپوٹوں پر کئی ہوئی

www.urduchannel.in

دھوپ کی قاش چبھنے نہ لگتی، میں جاگ اٹھنے کو ٹالتی رہتی ہوں۔

رات ٹل چکنے کا اندازہ میں اپنے منھ کو لحاف میں گھسیڑ کر لیا کرتی ہوں۔ میں آنکھیں ایک دم نہیں کھولتی، پہلے اپنے ڈیلے پپوٹوں کے اندر ہی اندر گھماتی ہوں، دائیں بائیں نہیں، دائروی صورت میں، یوں جیسے ان کے اندر رس رس کر آنے والی روشنی کو رگڑ رگڑ کر مٹانا چاہتی ہوں۔ پھر پپوٹے باہم رکھے رکھے پھڑکانے کے بعد دھیرے سے آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ میں لگ بھگ ہر روز مشاہدہ کرتی ہوں کہ کثرتِ استعمال سے لحاف کے اندر، جہاں سے روئی اپنی جگہ چھوڑ گئی ہے، وہاں سے روشنی جھانکا کرتی ہے۔ میں اس جھانکنے والی روشنی کی مقدار اور تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا کرتی ہوں کہ باہر سورج کس قدر اوپر چڑھ آیا ہوگا۔

اگرچہ میں پوری طرح جاگ گئی ہوں مگر لحاف سے نکل آنا اب بھی مجھے گوارا نہیں ہے۔

تب، کہ جب میں چھوٹی تھی اور ہفتے بھر بعد چھٹی والا دن آتا تھا تو بھی مجھے یوں دیر تک بستر پر پڑے رہنا اچھا لگتا تھا۔ ماں حسبِ عادت ایک مقررہ وقت پر دھیمی اور رسیلی آواز لڑھکا کر اپنے کام میں جت جاتی، اور میں دیر تک ایک خواب کی سی کیفیت میں پڑی رہتی۔ اب بھی بالکل اسی طرح پڑے رہنا چاہتی ہوں۔ اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ ماں کی میٹھی پکار میرے کانوں میں قطرہ قطرہ ٹپکتی رہے۔

''شینا شینا''

جب میں لحاف اُلٹ دینے کا قصد کرتی ہوں تب بھی میرے چاروں طرف ماں کی خوش بو پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ تاہم مجھے کچھ اور وقت کے لیے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑتا ہے کہ اعصاب ڈھیلے کر کے پڑے رہنے سے، میری بوڑھی ہڈیوں پر ماس اور اعصابی ریشوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ حتیٰ کہ پڑے پڑے میرا پورا جسم دُکھنے لگتا ہے۔ یوں جیسے مجھے رات سوتا پا کر، تہ دار اندھیرا میرے اوپر کودتا رہا ہے۔

''شین شین''

''بھئی اپنی لاڈلی کو سنبھالو، میری چھاتی پر چڑھ کر کود رہی ہے۔''

میں تو صیف کی طرف محبت سے دیکھتی ہوں۔ مجھے ان کا محبت سے ہنسنا، کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جس طرح وہ ہونٹ لٹکا لٹکا کر مجھے پکار رہے ہوتے، اس سے میں جان جاتی کہ وہ محض مجھے اس لیے متوجہ کر رہے ہوتے ہیں کہ میں بھی اُس لطف میں شریک ہو جاؤں جو اُنھیں ننھی تارا کو اپنی چھاتی پر چلا کر اور کودنے کے لیے اُکسا کر حاصل ہو رہا ہوتا ہے۔

تارا کلکاریاں مارتے ہوئے تیزی سے پاؤں چلاتی ہے۔ تو صیف بے ساختہ ہنستے ہیں۔

میں ہنستے ہوئے اُٹھ بیٹھتی ہوں۔

ٹانگیں پسار کر بیٹھنے کے بعد جی چاہنے لگا ہے کہ آگے کو جھک کر رانوں کے ڈھیلے گوشت پر دھیرے دھیرے مکیاں برساؤں۔ وقفے وقفے سے ماس مٹھیوں میں بھر کر اسے ہڈیوں کے اوپر رگڑتے ہوئے سہلانا بھی بھلا لگ رہا ہے۔

''شی.....ناں''

''اب بس کرو۔''

ماں ہاتھ آگے کر کے مجھے روک دینا چاہتی ہے۔

''تم تھک جاؤ گی میری جان۔''

وہ محبت اور شکر گزاری کے جذبات سے کہتی ہے مگر میں اس کی پنڈلیاں سہلاتے رہنا چاہتی ہوں۔

''نہیں ماں، میں نہیں تھکوں گی۔''

میں فوراً کہہ دیتی ہوں اور ناراضی کا ناٹک کرتی ہوں۔

''لگتا ہے ماں، آپ کو مزہ نہیں آ رہا، کیا میرے ہاتھ سخت ہو گئے ہیں؟''

''تمھارے ہاتھ تو روئی کے گالے ہیں میری بیٹی۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم تھک جاؤ گی۔''

جب وہ میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہیں تو میں ماں کی دائیں ہتھیلی میں اُوپر کی

www.urduchannel.in

طرف اور شہادت کی انگلی کی پہلی پور پر ماس کی گانٹھوں کو صاف محسوس کر لیتی ہوں۔

میرے ہوش سنبھالنے تک ابا زندہ نہیں رہے تھے۔ ماں ہی میرا سب کچھ تھیں۔ محنت کرتے کرتے اور مجھے پالتے پوستے ان کی ہڈیوں نے کھال چھوڑ دی تھی۔ ایک بار وہ پھسل کر گریں' دائیں ہاتھ سے سہارا لینا چاہا اور کہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ ہڈی بعد میں جڑ تو گئی مگر جڑی کچھ ایسی بے ڈھب تھی کہ یہ جوڑ ماس کے اندر سے نہ صرف اُبھرا ہوا نظر آتا، دیکھنے پر چبھتا ہوا بھی محسوس ہوتا۔ میں ماں کا دائیاں ہاتھ تھام کر اس جوڑ کے اوپر اپنی پوروں سے مساج کرتی رہتی اور ہر بار پوچھا کرتی کہ انھیں اب بھی اس میں درد تو ہوتا ہوگا؟ ماں ہر بار کھلکھلا کر ہنستی' یوں جیسے مجھے یقین دِلانا چاہتی ہو کہ اُسے کوئی ذرہ درد نہیں ہوتا۔ تاہم ہر بار اُس ہنسی کے وقفے میں بائیاں ہاتھ اسی ابھرے ہوئے جوڑ پر لے جا کر اسے دبانے لگتی۔ ماں کی بابت سوچتے سوچتے میرا دل بھر آتا ہے۔ آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں اور بے اختیار انھیں پکارتی ہوں:

''ماں جی۔''

یوں جیسے وہ سامنے ہی بیٹھی ہوں۔ میں ان کی طرف دیکھے بغیر دہراتی ہوں۔

''ماں جی۔''

اپنی ہی آواز میری سماعتوں سے ٹکراتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے' یہ میری آواز نہیں' تارا کی ہے۔

''تارا' میری تارا''

میں چلتے چلتے تارا کی تصویر تک پہنچتی ہوں۔ تارا مسکرا رہی ہے۔

''تارا میرے وجود کا حصہ۔''

میں اسے جب بھی پکارتی' اسی طرح مسکرا کر میری طرف دیکھتی اور محبت سے ''ماں جی'' کہہ دیا کرتی۔ میں چاہے دس بار پکارتی' وہ دس بار ہی ''ماں جی'' کہتی۔ اور ہر بار محبت سے مسکرا کر دیکھتی۔ وہ جب بھی مسکرا رہی ہوتی' اس کے گال اوپر کو اچھلنے لگتے۔

تو صیف کے ہنسنے پر بھی اس کے گال اوپر کو اُچھلا کرتے تھے۔

www.urduchannel.in

تو صیف چلا گیا کہ اسے باہر اچھا چانس ملا تھا۔ وہاں سے لگ بھگ تین برس تک اس کے خط آتے رہے اور ڈالر بھی۔ آخری والے خط میں اس نے لکھا تھا کہ جلد ہی اسے گرین کارڈ ملنے والا ہے۔ بعد میں وہاں سے آنے والوں نے بتایا کہ اس نے وہیں ایک شادی کر لی تھی اور اس کی ایک بچی بھی تھی۔

خیر وہ واپس آجاتا تو میں اسے معاف کر سکتی تھی مگر اس نے اپنی زندگی سے ہمیں کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ میری محبت اسے یاد آئی نہ تارا کی' جو کبھی اس کے وجود کا حصہ تھی۔

''تارا' میری بچی۔''

میں تصویر اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہوں اور آنکھیں زور سے بھینچ کر آنسوؤں کو اپنے گالوں پر بہ جانے دیتی ہوں۔ اتنے توقف کے باوجود تصویر چھاتی سے الگ کر کے اوپر اُٹھانے تک، تارا کو دیکھنے کے لیے مجھے پانی کی دیوار صاف کرنا پڑتی ہے۔ تارا کے گال اچھل رہے ہیں۔

اور تو صیف کے بھی، مگر اس بار وہ ہنس نہیں رہے، یوں لگتا کسی شدید اذیت میں رو دینا چاہتے ہیں۔

میرا دھیان وہیں بندھا رہا تھا۔

اُدھر سے آنے والے عجیب عجیب خبریں دیتے۔ ان کے پھرا کیلے ہو جانے اور اپنے آپ کو تباہ کر لینے کی۔

میں ایک اسکول چلا رہی تھی، پس انداز کیے ہوئے اتنے وسائل تھے کہ میں ان تک پہنچ جاتی۔ مجھے نہ جانے کس برتے پر یقین ہو چلا تھا کہ اگر میں وہاں چلی جاتی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر واپس آجاتے، اپنی زندگی کے پاس، اپنی تارا کے پاس۔ مگر میں نہ جا سکی، اور وہ اپنے آپ کو اذیت دیتے، شراب کی چھینی سے اپنے اندر کو چھلنی کرتے، ایک بار کے اندر مر گئے۔

میں آپ کی اذیت کو سمجھ سکتی ہوں تو صیف۔ اور اپنوں سے کترانے کا سبب بھی۔

آپ اپنے بارے میں کسی بھی خبر کو ہم تک پہنچنے سے یوں روک دینا چاہتے ہوں گے کہ ہم مزید دُکھی نہ ہوں مگر ساری بُری خبریں آپ کے نہ چاہنے کے باوجود ہم تک پہنچتی رہیں، حتیٰ کہ

اپنے سامنے رشین ووڈ کا کا آدھا پیگ رکھے رکھے، لیری کے ننگے کندھے پر سر رکھ کر چپکے سے مر جانے اور وہاں موجود سب کی توجہ پا لینے کی بھی۔

تارا اپنے باپ کے بغیر بڑی ہوتی رہی' بولنا اور چلنا ایک ساتھ سیکھتی رہی' تب تک، تو صیف! میں آپ کی جانب سے مایوس نہیں ہوئی تھی۔ میں پوری طرح تو آپ کے مرنے تک مایوس نہیں ہوئی کہ میں ہر بار تارا کے اچھلتے گال چومتی تھی اور آپ کے اچھلتے گال دھیان میں رہتے تھے۔

میں اپنے ہونٹ اس کے گال پر رکھنے کے لیے یخ شیشے پر جما دیتی ہوں اور یخ شیشے سے اِدھر ہنسی جہاں تھی وہیں جم جاتی ہے۔

میں پچھلے تین دن سے خاموش پڑے ٹیلی فون کو دیکھتی ہوں' جمعرات سے پہلے یہ نہیں بجے گا۔ میری نظریں پھر تارا کی تصویر کھینچ لیتی ہے۔ وہ گال اچھال ہنسی ہنس رہی ہے مگر میں بہت گہرائی سے ابھر آنے والی بے اطمینانی کو محسوس کر کے بے کل ہو جاتی ہوں۔

''میرا مرد میرا بہت خیال رکھتا ہے۔''

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں کے کناروں پر صاف شفاف چمکتے موتیوں کے سے قطرے اُگ آتے ہیں۔

''وہ بڑی عمر کا مرد ہے نا، بہت خیال رکھتا ہے میرا۔''

وہ میرے جملے کا حوالہ دے کر میری چھاتی پر دُکھ کے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ تارا کا میاں اس سے عمر میں لگ بھگ دُگنا ہو گا مگر واقعی اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ تارا کو اس نے دنیا کی ہر آسائش مہیا کی ہوئی ہے۔ اسی کو وہ گھمانے نکلا ہوا ہے۔ وہ جمعرات سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔

میں واپس بیڈ پر آکر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتی ہوں' حالاں کہ میں جانتی ہوں کہ اس طرح بیٹھنے سے میری ٹانگیں سن ہو جایا کرتی ہیں۔

میری ٹانگیں یخ بستہ ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ میں سارے کمرے میں نظر دوڑاتی

www.urduchannel.in

ہوں۔ ہر کہیں، چھت کے وسط میں نصب فانوس کے قمقموں کی روشنی گھوم رہی ہے۔

میں نے اپنی خواہش کے مطابق گھر بنوایا تھا۔ اور جب یہ پچیس قمقموں والا فانوس لگ چکا تو سوچا تھا کہ میں اور تارا اس روشن گھر میں ہمیشہ رہیں گے حالاں کہ تارا اپنے جس کلاس فیلو سے محبت کرتی تھی، وہ اسے اپنے بوڑھے والدین کے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے منع کر دیا۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، جو بھی آیا، سب کو منع کرتی رہی۔ وہ پہلے پہل آنے والوں سے لاتعلق رہی۔ پھر جیسے اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں کبھی ہاں نہیں کہوں گی۔ وہ ایک لحاظ سے درست تھی۔ مجھے واقعی خدشہ ہو چلا تھا کہ ایک دفعہ کا اقرار مجھے ہمیشہ کے لیے اکیلا کر سکتا تھا۔ وہ چڑچڑی ہو گئی۔ اتنی کہ بات بے بات میرے ساتھ الجھنے لگتی۔ میں اس کو ساتھ رکھ کر بھی اکیلی ہو رہی تھی۔ اس سب کے باوجود میں اس بوڑھے مرد سے اسے شادی کرنے پر قائل نہ کرتی اگر مجھے موت کی دھمک سنائی نہ دیتی۔ وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔ ایک مدت سے تارا کی طلب میں کوئی نہ آ رہا تھا۔ وہ آیا تو میں نے تارا کو یہ کہہ کر منا لیا تھا کہ بڑی عمر کے مرد بہت خیال رکھا کرتے ہیں۔

''بڑی عمر کا مرد۔''

میں بڑبڑاتی ہوں۔ اپنی سن ہوتی ٹانگوں کو کھینچ کر بستر کے اوپر کرنا چاہتی ہوں مگر کوشش کے باوجود اوپر کھینچ نہیں پاتی۔ میں بوکھلا جاتی ہوں۔

''تو کیا موت میری ٹانگوں سے میرے بدن پر چڑھ رہی ہے؟''

میں سر جھکا کر موت کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں، میں بہ مشکل آگے کو جھکتی ہوں۔ اُوپر سے برسنے والی روشنی میرے قدموں میں نہیں ہے۔ میں کچھ اور زور لگاتے ہوئے آگے کو جھولتی ہوں اور ایک لمحے کے لیے عین قدموں کے درمیان نگاہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں۔ وہاں جہاں موت کا چہرہ ہو سکتا تھا۔ وہ وہیں ہے... سیاہ... گول... چپڑ چپڑ میری پنڈلیاں چاٹنے والا۔ میں جتنا زور لگا کر آگے کو جھولی تھی اس سے کہیں تیزی سے پیچھے کی سمت گرتی ہوں۔ اتنی سرعت سے گرنے کے دورانیے میں ہی میں یہ بھی جان جاتی ہوں کہ میری پنڈلیاں چاٹنے والی

موت تھوتھن جیسی ہے۔

میں پُرسکون رہنے کے لیے ان سب کو یاد کیے جانے کی کوششیں جاری رکھنا چاہتی ہوں جو میری زندگی میں کسی نہ کسی طرح شامل رہے۔ مگر تھوتھن...

یہ بھی تو میری زندگی میں دخیل رہا ہے۔ وہ گھٹنوں کو جکڑ کر اوپر چڑھتا ہے۔ میری رانوں کا ڈھیلا گوشت، یوں لگتا ہے جیسے تن گیا ہے۔

''تھوتھن... بھ...'' نامکمل سسکاری میرے ہونٹوں پر سرسراتی ہے۔

بڑی عمر کا مرد میرے دھیان میں ہے، ہونٹوں کے اوپر سفید جھولتی مونچھوں والا۔ اعصاب ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں۔ یوں، جیسے کہ میں وہاں نہیں ہوں کہ وہاں تو تارا ہے۔ تھوتھن کی گیلی تھوتھنی سے بچانے کے لیے وہ اپنا بدن سمیٹ لینے کے جتن کرتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میری انگلیاں میری ہتھیلیوں میں سمٹ رہی ہیں۔

لجلجا اندھیرا رانوں پر گدگدی کرتا ہے۔

اس کی تھوتھنی سے آگے کو جھولتی مونچھیں سانسوں میں رخنے ڈالتی ہیں تو مجھے ابکائی آ جاتی ہے۔

میرے حلق کو چیر کر بہ نکلنے والا گیلا پن میری گردن سے نیچے تک بہتا جا رہا ہے۔ اندھیرا بدن چاٹتا اوپر اٹھ رہا ہے۔ اندھیرا نہیں لجلجا تھوتھن۔ وہ کلبلا چبانے کے بعد گردن دبوچتا ہے جب کہ میں اندازہ لگانے کے جتن کر رہی ہوں کہ ہم دونوں میں سے کون ہے جو اس کا لقمہ بن رہا ہے۔

×××

کُوک بھرا کھلونا

کتنی عجیب بات ہے یہ، کہ وہ، جو کئی کرداروں کی زندگی جیتا تھا، اچانک مرگیا۔

وہ اپنے کرداروں کو چھوتا تھا، یوں کہ وہ جی اٹھتے تھے۔ اس جی اٹھنے کا راز اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ ان کی کھال میں گھس کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔

یوں لگتا ہے اس نے بوڑھی عیار موت کو بھی جی اٹھنے والا کردار بنانا چاہا تھا، اپنی کہانی کا کردار۔ اور ابھی دن پوری طرح معدوم نہیں ہوا تھا کہ اس سیاہ چشم کے ڈھیلے ماس کے جھریوں بھرے جال میں گھس کر وہ راستہ بھول گیا۔

اس نے عجب عجب کرداروں کی کہانیاں لکھی تھیں، ''تیرھواں کھمبا'' نامی محبت کی کسک کو جھیل جانے والی انجی کی کہانی، جو ایک تہذیبی رشتے کے تقدس میں بندھ کر دولخت ہوگئی تھی۔ اور پیچھے کی سمت بھاگتے کھمبے گننے والے اس کے عاشق کی کہانی بھی، جس نے اپنی محبوبہ کو اپنے شوہر کے ساتھ دیکھا تو اسے لگا تھا جیسے تیز رفتار ریل کار کا انجن اس کے اوپر سے گزر گیا ہو اور اس کی بوٹیاں ہوا میں اڑ رہی ہوں۔ اپنے اندر کی گھٹن کے تعفن اور باسی پن سے بھاگ نکلنے والی ''بند مٹھی میں جگنو'' کی اس شہری لڑکی کی کہانی، جس نے پہلی بار ننگی گالیاں سنی تھیں تو اس کے بدن سے چمٹی ہوئی جونکیں ایک ایک کر کے جھڑ گئی تھیں اور لچی لفنگی مشٹنڈی ہونے کے طعنے سننے اور سنانے والی پھپھے کٹنیوں سے پوشیدہ رکھے جانے والے انسانی اعضا کے ناموں کو

www.urduchannel.in

فراوانی سے سنا تو اپنے بدن میں باسی ہو جانے والی زندگی کو تازہ ہوتے اور ایک لذت کو پھوٹتے پایا تھا۔ میلہ دیکھنے آنے والے اس شخص کی کہانی جس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ''راستے بند ہیں''، جیسی اس انوکھی کہانی کا یہ عجب کردار لکھتے ہوئے اس نے اپنے اندر کی ساری لذت اس کے اندر اتار دی تھی۔ حتی کہ ٹرک کے نیچے آکر کچلا جانے والا کوئی اور تھا مگر موت کی لذت اس کے اندر اتری جو خالی جیب میلا دیکھنے آیا تھا لہٰذا وہ مرگیا تھا۔

کچی پکی قبریں، پانی میں گھرا پانی، رکی ہوئی آوازیں، بوکا، تماشا، راتب، جیکو پیچھے، بیک مرر، وقت سمندر، سارنگی، پوئی تحسین، نظر کا دھوکہ، پنج کلیان، سزا اور بڑھادی، درخت آدمی، کنم کانہ۔

کنم کانہ کا کھیل چلتا رہا۔ وقت لمحہ لمحہ کر کے تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتا رہا اور وہ کرداروں کی لکیریں بناتا اور انھیں کاٹتا رہا۔

اُس نے عجب عجب ذائقے لکھے اور ان کا چکھنا لکھا۔

نئے نئے مناظر لکھے اور اُن کا دیکھا جانا لکھا،

انوکھی انوکھی خوش بوئیں لکھیں اور ان کا مشام جان میں اُترنا لکھا،

لذت بھرے لمس کو محسوس کیا اور اسے زندگی بنا کر لکھا۔

اس نے جس طرح اپنے کرداروں کو شدت سے سوچنے پر اُکسایا اور اتنے ہی بھولپن سے انھیں دانش بھرے سوالات کے مقابل کر دیا۔

بے پناہ محبت کی طویل نہر کھودی اور ساری آدمیت کو اس کے کنارے بسانا چاہا۔

محترم ہو جانے والے رشتوں کو لکھا اور اپنے محبوب کرداروں کو اس ریشمی ڈور میں پرونا چاہا۔

کرداروں کے اندر ایک عجب طرح کی حمیت جگائی اور ان کے لہو میں اپنی رہتل کی خوش بو کو اتار دیا۔

عجب عجب کہانیاں، عجب عجب کردار۔ کہیں موت کے کھلیان سے اُگتی ہوئی

www.urduchannel.in

زندگی۔ کہیں زندگی کی نس نس میں اُترتی ہوئی موت۔

یوں نہیں ہے کہ موت اس کے لیے کوئی اجنبی کردار تھا اس نے اسے محبت سے لکھا ہے اور سفاکی سے بھی۔ یہ موت کبھی تو انجی کی چیخ کے بعد اس کے تھرتھر کانپے چلے جانے پر اس عاشق کی سی ہوگئی تھی جو ریل کار کے نیچے کچلا نہیں گیا تھا بلکہ اس کے دروازے میں کھڑا ہوا کے جھونکوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور کبھی علی احمد پر قسطوں میں اُترنے والے اس عذاب جیسی، جو مرنا چاہتا تھا مگر نہیں چکتا تھا حتیٰ کہ اس کی اپنی بیوی نے جھنجھلا کر پوچھا تھا'' کیا ہم سب کو مار کر مرنے کا ارادہ ہے''۔ اسی کہانی میں موت نے آ کر موت کو آوازیں دینے والی اسی عورت کی ''سزا اور بڑھا دی'' تھی۔

ادبدا کر کھسک جانے والی موت سے لے کر ترسا ترسا کر مارنے والی موت تک، ایک ہی ہلے میں بہت سارے انسانوں کو مار ڈالنے والی موت سے لے کر اس شخص کی موت تک جسے ''پولی تھین'' کھا کر مرنا تھا مگر جو مومی لفافے کے تعاقب میں بجلی کے کھمبے پر چڑھا اور کرنٹ لگنے سے مر گیا تھا۔

سب طرح کی موتیں اس نے لکھ ڈالی تھیں۔

مگر یوں لگتا تھا کہ جیسے جو موت اسے لکھنا تھی، وہ ابھی باقی تھی لہٰذا وہ خود اس کے ڈھیلے ماس کے جال میں اُتر گیا۔

اچھا یوں نہیں ہے کہ اچانک وہ اپنے نصیبے میں لکھی ہوئی موت کے مقابل ہوا تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے ادراک میں کہیں پہلے سے تھا تاہم یوں ہے کہ میرے لیے یہ مرحلہ ٹوٹ پڑنے والی قیامت کا سا تھا۔

مجھے یاد ہے کچھ عرصہ پہلے جب اس کے دل کی دھڑکنیں اپنا آہنگ چھوڑنے لگی تھیں اور اس نے اپنی چھاتی کا ماس کٹوا کر اس میں پیس میکر رکھوا لیا تھا۔ اس نے ایک کہانی لکھی تھی، ''کوک بھرے کھلونے۔''

تب اس نے بتایا تھا کہ موت اُسے چھو کر نکل گئی تھی۔

وہ ساری عمر عجب اور انوکھے خیال سوچتا اور لکھتا رہا۔ موت اسے چھو کر گزری تو اس نے اپنے آپ کو ایک کوک بھرا کھلونا کہا۔ کہانی مکمل ہوگئی تو مجھے بلایا اور مزے لے لے کر ساری کہانی مجھے سنا دی۔

کہانی سنا چکا تو اس نے سوچے ہوئے کئی عنوان میرے سامنے رکھ دیے۔

ایک---

دو---

تین---

چار---

میں نے کہا'' کوک بھرا کھلونا۔''

کہانی میں کوک بھرے کھلونے کا حوالہ آیا تھا، ایسا کھلونا جس میں چابی بھرتے ہیں اور وہ زندہ ہو جاتا ہے، مگر یہ عنوان اس فہرست میں نہ تھا جو اس نے سوچے تھے۔ وہ الجھن میں پڑ گیا کہ اس عنوان سے وہ سب الجھن میں پڑ سکتے تھے تو فوری طور پر'' کوک'' جیسے لفظ سے معنی اخذ نہ کر سکتے تھے۔

کہانی کو الجھاوا بنانے والوں پر وہ خوب برستا تھا۔ ترسیل اسے عزیز تھی تاہم اسے محض واقعہ بنا ڈالنے کے حق میں بھی نہ تھا۔

اچھا جملہ کہنا، تہذیبی تناظر اچھالتا ہوا، دیہی دانش سے لبالب بھرا ہوا، مٹی کی خوشبو میں گندھا ہوا مگر کہانی کے اندر پوری طرح پیوست، ہاں یہ بھی اسے عزیز تھا

اور کہانی کا ایسا عنوان، جو پوری توجہ کھینچ لے اور پڑھنے والے کو کہانی کی طرف مائل کر دے۔ کہانی کی طرف اور اس تخلیقی حصار کی جانب بھی جو وہ اپنے جادو بھرے بیانیے سے کھینچا کرتا تھا۔

خیر میرا اصرار بڑھا تو اس نے کہانی کے اوپر یہ عنوان جما کر اسے کئی بار دہرایا۔ پھر چپ ہو گیا اور اپنی چھاتی پر وہاں ہاتھ رکھا جہاں اس نے پیس میکر لگوا رکھا تھا۔

www.urduchannel.in

اس نے بتایا تھا:

''جب میں نے ڈاکٹروں سے یہ پوچھا تھا کہ اس مشین کی کوئی گارنٹی ہے، جو آپ نے میری چھاتی میں گاڑ دی ہے تو انھوں نے کہا تھا ہاں، مگر آدمی کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔''

پھر وہ خود ہی ہنسنے لگا تھا۔ وہ ہنستا رہا۔ نہیں، شاید وہ ہنسنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ تب ہی تو میں بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ جھینپ کر چپ ہو گیا اور میرا دل رکھنے کو وہ کہانی سنانے لگا جو ڈاکٹروں نے اسے کچھ سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے سنائی تھی۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جو مر گیا تھا مگر اس کا پیس میکر اس کے مرنے کے بعد بھی کام کرتا رہا۔ یہ پیس میکر بعد ازاں مرنے والے کی وصیت پر ایک اور ضرورت مند کو لگا دیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس مشین کی قیمت بتائی تھی جس کی کارکردگی کو کمپیوٹر سے آنکا جا سکتا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ پیس میکر ابھی تک اس ضرورت مند کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔

''کوک بھرا کھلونا'' میں نے دُہرایا۔

یوں لگتا تھا اسے میری تجویز اب اچھی لگنے لگی تھی اس نے اسے تھوڑا سا بدل کر لکھا

''کوک بھرے کھلونے۔''

پھر میری طرف دیکھا، کہا:

''یہ ٹھیک رہے گا کہ ہم سب تقدیر کے ہاتھوں میں کوک بھرے کھلونے ہی تو ہیں۔ پتہ نہیں کب اور کہاں کوک ختم ہو جائے۔''

مقدر کو بدل لینے کا اس میں حوصلہ تھا، ساری عمر اس نے یہی تو کیا تھا یوں لگتا ہے، وہ مسلسل اپنے قلم سے اپنی تقدیر میں کمی بیشی کرتا آیا تھا، مگر کچھ برسوں سے مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ موت جس سے وہ کنی کاٹ کر گزرنا چاہتا تھا اس کی محبوبہ ہو گئی تھی، سیاہ چشم محبوبہ۔ موت کو سیاہ چشم اس نے تب کہا تھا جب وہ گلابوں کی مہک کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہی تھی اور جب اس کی یہ محبوبہ اس کے مقابل آئی تو اس کی کہانی کو اس نے شام پڑنے سے پہلے پہلے لکھنا چاہا۔

عصر کا وقت ڈھل رہا تھا۔

شام پڑنے اور رات کے آ لینے میں ابھی کئی سے باقی تھے، اس کی کہانی مکمل ہو گئی اور سارا خسارہ ہماری جھولی میں آ گرا تھا کہ موت کی کہانی لکھتے ہوئے وہ اپنے بدن میں لوٹ کر کوک بھرنا بھول گیا تھا۔

(منشا یاد کی یاد میں)

××÷××

www.urduchannel.in

اُلٹی ہتھیلی پر رُکی ہوئی گیٹی

جہاں میں رہتا رہا، وہ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سکون سے رہا جا سکتا تھا۔ سڑک پار کرتے ہی عارضی دکانوں کا ایک سلسلہ دور تک پھیلتا چلا جاتا۔ وہاں ہفتے میں تین روز سستا بازار سرکاری سرپرستی میں لگایا جاتا تو یہ دکانیں ٹانگیں پسار لیا کرتیں، اتنی کہ راہ گیروں کا گزرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ تب سے ادھر پار سے آیا کرتا، اسی سستے بازار کے اندر سے۔ کھی کے خالی کنستروں کو کاٹ کر سیدھے کیے گئے ٹین کو پھلوں والی پیٹیوں کی پھنیوں کے اوپر مڑھ کر ان دکانوں کی دیواریں اساری اور چھتیں ڈالی گئی تھیں۔ ٹین اور لکڑی سے اُٹھائی گئی ان عارضی دکانوں کے آگے سفید بنیانوں کی قطاریں ہوتیں، گتے کے ڈبوں کے اُوپر موی لفافوں میں جرابیں سجی ہوتیں، ڈیم سیم کے دھاگوں سے گندھے ہوئے ازار بند اور پراندے جھول رہے ہوتے۔ ان ہی دکانوں کے آگے رسیوں سے چمگادڑوں کی طرح لٹکتی اور بے حیائی سے کھلی ہوئی، مختلف سائز کے جم سمیٹنے کے منتظر زیر جامے، کالی، آتشی سرخ، جامنی اور نہ جانے کیسے کیسے رنگوں کی جالی دار انگیاؤں کے اندر سے وہ برآمد ہوتا، کبھی پہلو سمیٹ کر بچتے ہوئے اور کبھی جھک کر خود کو بچاتے ہوئے۔ اور جب وہ سامنے آجاتا' تو جب تک وہ نظر میں رہتا' بس وہیں رہتا تھا۔

بعد میں چار دیواری بنا کر اس بازار کی حد بندی کر دی گئی۔ آنے جانے کے لیے

آہنی گیٹ لگ گئے اور ہر ایک پر نظر رکھنے کے لیے وہاں وردی والے پہرے دار متعین کر دیے گئے۔ اس کا معمول پہلے کی طرح رہا۔ وہ ادھر اُس طرف والے گیٹ سے داخل ہوتا اور اس بازار کے اندر اندر سے ہوتا ہوا عین اس سامنے والے گیٹ سے نکل کر ادھر والی سڑک پر آجایا کرتا۔

میں اس کا کبھی منتظر نہیں رہا، وہ تو بس خود ہی نگاہ میں آجایا کرتا تھا۔ وہ کھڑکی جو سڑک کی جانب تھی، مجھے صبح ہی صبح کھول دینا ہوتی کہ بند گھر میں اماں کی سانسیں گھٹتی تھیں۔ کھڑکی کھل جاتی تو جیسے وہ باہر کی رونق کا حصہ ہو جاتیں۔ اماں کو اگر وقت پر وہیل چیئر پر بٹھا کر کھڑکی کے سامنے نہ بٹھایا جاتا تو وہ غل مچا دیا کرتیں۔ ان کا خیال تھا ہم نے انہیں گاؤں کی کھلے ماحول سے لا کر یہاں اس ڈربہ نما مکان میں قید کر دیا تھا اور پیچھے جو کچھ تھا اسے بیچ باچ کر کھانے اُڑانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ خیر، اماں اس معاملے میں زیادتی کرتی تھیں، بھلا جو پیچھے رہ گیا تھا کس کے لیے تھا؟ یہ بات سونیا نے جب بھی پوچھی، اماں نے کہا، تمہارے لیے، اور پھر لگ بھگ بین کرتے ہوئے ہر بار یہی دہرایا کہ مجھے زندگی میں ہی کھ سے ہولا تو نہ کرتے اماں یہاں واقعی قید ہو کر رہ گئی تھیں، انہوں نے کھانا پینا کم کر دیا تھا۔ کہتی تھیں، بھوک ہی نہیں لگتی۔ ہڈیوں نے ماس چھوڑ دیا اور وزن بس تنکوں کا سا ہو گیا تھا۔ جب وہ گاؤں میں تھیں تو مجھے وہاں والوں کے طعنے سننا پڑتے تھے کہ بڑھیا گور کنارے جا لگی مگر اکلوتی اولاد اسے سنبھالنے نہ آئی اور اب جب کہ میں اُسے لے آیا ہوں تو سنا ہے لوگ کہتے پھرتے ہیں: بڑھیا اپنے نام کی پٹی باڑی اپنے بھائی کے نام کرنے لگی تو دیکھو بیٹا کیسے بھاگے آیا۔ گاؤں والے تو خیر کسی حال میں راضی رہنے والے نہیں مگر ادھر سونیا بھی تو سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ گھر کے اندر ایک عجب تناؤ تھا جو سارے میں بھر گیا تھا۔ یہی سبب ہوگا کہ اماں کے غل مچانے سے پہلے ہی مجھے بھی طلب ہونے لگتی کہ کھڑکی کھول دوں۔ جوں ہی کھڑکی کھلتی باہر کا منظر نگاہ میں بھر جاتا۔ ایسے ہی کسی لمحے میں وہ بھی نظر آجایا کرتا تھا جس کا میں کبھی منتظر نہیں رہا تھا۔

www.urduchannel.in

ابھی وہ میری نظروں سے اوجھل نہ ہوا ہوتا کہ اماں باہر کی بھیڑ دیکھتے ہوئے اپنے بچپن میں کھو جاتیں۔ داہنے ہاتھ کی اُنگلی سامنے والے لوگوں کے ریلے کی طرف اُٹھاتے ہوئے گنگنانے لگتیں:

''اِک ساں... دوساں... تن ساں... چار ساں... وینیاں نی وار ساں۔''

ایک' دو' تین اور چار گننے کے لیے اُٹھی ہوئی اُنگلی سے متصل اُنگلیوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتیں' انگوٹھا چھوٹی انگلی کی پہلی پور سے پھسلاتے ہوئے ساتھ والی کی پہلی پور تک گھسیٹ لاتیں اور پھر ہاتھ نچاتے ہوئے' چلے جانے کی یوں پیشین گوئی کرتیں' جیسے اب اُن کے لیے یہاں کچھ بھی نہ بچا تھا۔ وہ مزے مزے سے جو کچھ کہہ رہی ہوتیں' میرے لیے اُس کا حرف حرف مہمل ہوسکتا تھا' نیا نہیں تھا۔ میں جب چھوٹا تھا تو دینے موچی کی بیٹیاں جب 'پتو' کہہ کر آمنے سامنے ہو بیٹھتیں' پہلے ایک پھر دو' تین اور چار کے بعد زگڑ زگڑ کر پتھروں کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ساری گولیوں کو اُلٹی ہتھیلی پر روکتے ہوئے سیدھے رخ پھسلا کر اُچھالتیں اور 'وینیاں نی وار ساں' تک پہنچتی تھیں تو میں بھی دبے پاؤں اُن کے سروں پر پہنچ چکا ہوتا۔ اس سے پہلے کہ ہوا میں اُچھالی گئیں گولیاں، جنہیں ہم گیٹیاں کہتے تھے، واپس بختو یا بیگو کی ہتھیلی کو چھوتیں، میں انہیں اُچک کر بھاگ نکلتا۔ یقیناً اماں بھی اپنے بچپن میں اسی طرح کھیلا کرتی ہوں گی۔ مگر اب اماں 'وینیاں نی وار ساں' اتنی محویت اور اِتنے تزجاؤ سے کہتیں کہ میں سوچنے لگتا، ان کے جانے کی باری واقعی آ لگی تھی اور اماں نے تو جیسے تقدیر کی کارنس پر پڑی کتاب میں حقیقت کے اس حرف کو یقین کی آنکھ سے آنک لیا تھا۔

وہ جو ایک' دو' تین میں تھا نہ چار میں' یوں لگتا' ایسے ہی کسی لمحے میں میرا دھیان لوٹنے کے لیے چاروں طرف سے آجایا کرتا تھا۔ وہ آتا تو ادھر پار سے تھا، سڑک پر اِس جانب اُترتے ہی دائیں جانب کو نکل جاتا۔ مگر جاتا کہاں تھا، لگتا، چاروں طرف سے آکر مجھے گھیر گھار کر وہیں بیٹھ جاتا تھا۔ جی' میں اشعر ساجد کی بات کر رہا ہوں۔ وہی' جو شام پڑتے ہی ڈائمنڈ مارکیٹ والے چائے خانہ کے سامنے برامدے میں کرسیاں کھینچ کر اپنے شاعر دوستوں کے

انتظار میں آ بیٹھتا تھا۔ اس نے شاعر کی حیثیت سے خوب نام کما رکھا تھا۔ اس چھوٹے سے چائے خانے کے سامنے بیٹھنے والے اس کے دو ہی دوست تھے، عبدالرحیم نعمان اور محمود عالم' جو ہمیشہ اس کے آچکنے کے بعد آیا کرتے تھے۔ نعمان سیکرٹریٹ میں اچھلی بھلی پوسٹ پر تھا، اور کبھی کبھار شعر کہہ لیا کرتا۔ محمود حد درجہ کا نکھٹو' مگر تھا میرے باس کا چہیتا۔ محمود اسی ادارے میں، مجھ سے نچلے درجے میں کام کرتا تھا' جس میں' میں تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ اشعر جیسا عمدہ شعر تو نہ کہتا تھا مگر استاد شاعر کہلواتا۔ لگتا بھی استاد ہی تھا کہ ہمیں اکثر مشہور شاعروں کے ہاں در آنے والی فروگذاشتیں بتایا کرتا۔ میرے باس سے اس کی شاید اس لیے گاڑھی چھنتی تھی، کہ باس کو شعر کہنے کا چسکا تو تھا لیکن اسے بہ وقت اپنے کلام کی اصلاح کی شدید حاجت رہتی تھی۔ محمود' غالب کا یہ مصرع اکثر دہرایا کرتا: 'شعر کی فکر کو اسد، چاہیے ہے دل و دماغ' گویا وہ کہنا چاہتا تھا کہ ان دونوں کے معاملہ میں باس کا ہاتھ تنگ تھا۔ میں نے جب بھی محمود کو دفتر کی کوئی اسائنمنٹ دینے کی کوشش کی، اس نے باس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچا سامنے رکھ دیا۔ اس پرچے پر میں نے لگ بھگ ہر بار ہر شعر کو کاٹ کرنے ڈھنگ سے لکھا ہوا پایا اور اندازہ لگا لیا کہ محمود کا کام کتنا کٹھن تھا۔ یہ دونوں اشخاص اتنے اہم نہیں ہیں کہ ان کا قصہ طول کھینچتا چلا جائے۔ بس مجھے یہی بتانا تھا کہ محمود تو وہاں بیٹھتا ہی تھا، باس بھی کبھی کبھار وہاں آنکلتا تھا۔ ایسے میں مجھے مارکیٹ جانا بھی پڑتا تو کنی کاٹ کر گزر نہ سکتا۔ ہم جان گئے تھے کہ وہ وہاں اشعر کو اپنی اصلاح شدہ غزلیں سنانے آتا تھا۔ اشعر ایک حساس ادارے میں ادنیٰ درجے کا ملازم تھا۔ خیر، یہ درجہ اتنا بھی معمولی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کے ملازم اس درجہ کو خوب استعمال میں لا کر اس سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ وہ ایسا نہ تھا' سب نے مجھے یہی بتایا تھا۔ اس کا شعر بھی تو ایسا نہ تھا کہ کوئی ان سنا کردے لہٰذا سب کی توجہ پاتا اور میں، کہ جس کے لیے شاعری محض کار بے کار تھا، بھی ادھر دھیان دینے پر مجبور تھا۔

×÷×

اماں کو میں نے قائل کرنا چاہا تھا کہ وہ باڑی پٹی جو بعد میں بہ ہر حال بہ قول خود اماں

www.urduchannel.in

کے میری ہی تھی، ابھی سے میرے نام کر دے کہ میں اس سے حاصل ہونے والی رقم کو بہتر جگہ پر لگا سکوں۔ ایک سے ایک بڑھ کر انویسٹمنٹ پلان تھا میرے ذہن میں، مگر اماں ابا کے مرنے کے بعد میرے نام منتقل ہونے والی جائیداد کا ذکر لے بیٹھتیں، جو میں اوائل عمری کی ناتجربہ کاری میں گنوا بیٹھا تھا۔ میرا اصرار بڑھا تو اماں لگ بھگ مان ہی چلی تھیں لیکن پتہ نہیں اسی عرصہ میں بہو سے کیا سن لیا کہ ایک بار پھر صاف مکر گئیں۔ سونیا کا خیال تھا کہ بڑھیا مان جانے کا ڈرامہ کر رہی تھی اور یہ کہ میں اپنی ماں کو ٹھیک سے کہتا ہی نہیں تھا۔ بس اسی سے سارا کھیل بگڑ گیا۔ اس نے اپنے ڈھنگ سے بوجھ ڈال کر اماں کو اپنے ڈھب پر لانا چاہا۔ سونیا میں خرابی یہ تھی کہ جب اس کے من میں کچھ آ جاتا، تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ کل تک وہ دباؤ جو وہ مجھ پر ڈالتی رہی، سب اماں پر منتقل ہو چکا تھا۔ شاید یہی وہ دباؤ تھا جو اماں کے دل اور ذہن پر مسلسل پڑنے لگا تھا۔ ان پر ڈپریشن کے شدید دورے پڑنے لگے۔ ازاں بعد خود سونیا بھی اعصابی تناؤ کی مریضہ ہو گئی۔ بقول اس کے یہ ایک ذہنی مریضہ کے ساتھ رہنے کا شاخسانہ تھا۔ خیر اماں ایسی بھی ذہنی مریضہ نہ تھیں کہ گھر کا ماحول ہی خراب کیے رکھتیں۔ بس صبح صبح انہیں کھڑکی کے سامنے لے جانا ہوتا تھا۔ اسی کھڑکی کے سامنے جس میں سے باہر کا سارا منظر اندر آ بستا تھا یا جس کے اندر وہ اتر کر اپنے ماضی میں جا بسا کرتی تھیں اور جس میں سے مجھے اشعر بے نیازی سے بھیڑ کو کاٹتے چیرتے، ٹھیلے الانگتے پھلانگتے اور سوٹلوں سے بندھے ہرے رنگ برنگے ہورزری کے سامان کو ہاتھوں سے ادھر ادھر دھکیلتے سڑک پر آتے اور پھر ایک طرف نکلتے نظر آ جایا کرتا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ اماں مر گئی، کھڑکی بند ہو گئی، گھر بدل گیا۔

اور اب خبر آئی ہے کہ وہ بھی اذیتیں سہتے سہتے مر گیا ہے۔

اماں نے اپنے مرنے سے پہلے ہی خود کو مار لیا تھا۔ اگرچہ وہ ہم دونوں سے بہت پہلے سے لاتعلق سی ہو گئی تھیں تاہم اس کے باوجود ان میں زندگی سے جڑنے کے آثار پائے جاتے تھے۔ میں انہیں اپنے حال میں مست، ہوا میں ہاتھ نچاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا جیسے وہ

کبھی الٹی اور کبھی سیدھی ہتھیلی سے گیٹیاں اچھال اور روک رہی ہوں۔ اور اس گنگنانے کو بھی سن سکتا تھا جس میں اس کا بچپن گھل مل گیا تھا:

ڈیڈو... کالی بھیڈو... کالا دانا... چھج پرانا... ماں کولوں پتر سیانا

کچیا... اماں دیا بچیا... اماں گئی پانی... رل گئی سیانی

پتو، ڈیڈو، کچیا گنگناتے گنگناتے اماں ایک روز اچانک مر گئی۔

اماں کے مرنے کے بعد، یوں ہی بے دھیانی میں کبھی میں پتو، ڈیڈو یا کچیا گنگنانے لگتا تو سونیا ہتھے سے اکھڑ جاتی۔ اس کا خیال تھا' بڑھیا جو کچھ کرتی تھی وہ محض اس کے بچپن کا بے ضرر کھیل نہ تھا' کہ وہ تو کبھی اسے کوسنے کے لیے 'ڈیڈو' کی 'کالی بھیڈو' بنا دیتی اور کبھی اپنے لخت جگر یعنی مجھ پر طنز فرمانے کے لیے 'ماں کولوں پتر سیانا' کی چوٹ لگایا کرتی۔ بقول سونیا کے ہم نے اماں کو پھولوں کی سیج پر رکھا ہوا تھا مگر بڑھیا اتنی کم ظرف نکلی کہ مرنے تک کہتی رہی ... 'رل گئی سیانی'۔

سونیا کا بکنا جھکنا اپنی جگہ، مگر سچ یہ تھا کہ اماں کے چل بسنے کے بعد ہمیں گھر بدلنے کے لیے وسائل میسر ہو گئے تھے۔

نیا گھر ہماری توقعات اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کشادہ تھا۔ سامنے دو رویہ سڑک اور بغل میں گلی۔ تاہم ادھر کی کسی کھڑکی پر بازار کا ویسا منظر نہ کھلتا تھا جس کا میں ایک مدت سے مشاہدہ کرنے کا عادی تھا۔ شاید یہی سبب رہا ہوگا کہ میں اماں کو' اوہ جی نہیں' اسے' جو اماں کے لیے کھڑکی کھولتے ہی ادھر بھیڑ میں سے نکل کر سامنے آیا جایا کرتا تھا' لگ بھگ بھول ہی چکا تھا۔ جی' ایسا ہی' اس کے باوجود کہہ رہا ہوں کہ شاعر ہونے کا مدعی میرا باس اور اس کا عروضی چمچہ محمود' دونوں اس کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے کر ہی دیا کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ دونوں اس سے حد درجہ مرعوب تھے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ ان تذکروں نے اسے بس ایک نام سا بنا دیا تھا۔ ایسا نام، جس کے ساتھ میں اس کے زندہ وجود کا وہ تصور جوڑ لیا کرتا جو اماں کے زندہ رہنے اور کھڑکی سے وابستہ ہونے تک واقعی میرے اندر بھی زندہ ہو جایا کرتا تھا۔

www.urduchannel.in

وقت گزرنے کے ساتھ دفتر کی فضا سے بالکل غیر محسوس انداز میں اس کا ذکر بھی معدوم ہوتا چلا گیا۔ جس چائے خانے پر وہ بیٹھا کرتا تھا وہ وہاں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی وجہ سے جیل چلا گیا تھا۔ انسانی سمگلنگ کا سنگین جرم اس کے بیٹے سے سرزد ہوا تھا۔ اپنے باپ کے ہم درجہ جو کچھ حاصل کر چکے تھے اور اس کا باپ جسے لائق اعتنا نہ جان رہا تھا، کم سے کم وقت میں اس سب کا حصول اس کے بیٹے کے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ مواقع پر اپنے باپ کا نام استعمال کیا۔ جب پکڑا گیا، تو ان ہی حوالوں سے خود اشعر کے محکمہ والوں نے اسے بھی پھانس لیا۔ محمود بھی اب دفتر میں اس کا نام لینے سے احتراز کرنے لگا تھا۔ اس نے اس کی بہ جائے کچھ اور لوگوں کا ذکر شروع کر دیا تھا۔ یہ نئے نام میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ یہ لوگ بھی یقیناً شاعری میں درک رکھتے ہوں گے، مگر میری بلا سے۔ شاعر باس کے تبادلے کے بعد میں نے عروضیے محمود کی ڈھیلی طنابیں کھینچ لیں کہ اب وہ مجھے میرے باس کا استاد بن کر بلیک میل نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے پہل مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر اپنا دھیان دفتری امور پر مرکوز رکھنے کا ڈرامہ رچانے لگا ہو۔ میرا خیال تھا کہ جس گوں کا وہ آدمی تھا وہ زیرِ نظر امور کا نوٹ ڈھنگ سے لکھ لینے پر کبھی قادر نہ ہو سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ وہ بہت منضبط نوٹ لکھنے اور بڑے سلیقے سے فائل چلانے لگا تھا۔

اس بدلی ہوئی فضا میں، اسی تبدیل ہو چکے میرے ماتحت محمود نے ایک روز ذہن سے محو کر دیے جانے والے اس شخص کا نام اپنی ایک فائل میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اور جھجکتے ہوئے لیا۔ اور ابھی اس کی کمر پوری طرح سیدھی نہیں ہوئی تھی کہ دوسری بار نام لیتے ہوئے اس کی سسکاری نکل گئی۔

کیا ہوا اشعر کو؟

اس کی کیفیت دیکھ کر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کر دیا۔ اس نے ضبط کرنے کے لیے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ میرے سوال پر اس کا ضبط ٹوٹ گیا، ہچکی بندھ گئی

اور وہ بہ مشکل بتا سکا کہ وہ مر گیا تھا۔

''وہ اچانک ہی مر گیا ہے، ۔۔۔ اندر جیل میں ۔۔۔ اذیت کی موت ۔۔۔ نہیں، نہیں، اُسے ایسی موت نہیں مرنا چاہیے تھا۔۔۔ وہ ۔۔۔ خود مرا نہیں، اس کے بیٹے نے مار دیا ہے اُسے ۔۔۔ ہاں، بیٹے نے اور بیٹے کی محبت نے۔''

یہ سب اس نے روتے روتے اور اپنے ہاتھ باہم رگڑتے اور مسلتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا تھا مگر بیٹا۔۔۔''

وہ ایک دم چپ ہو گیا، یوں جیسے کوئی بات جو زبان پر آ گئی تھی اسے لوٹانے کے جتن کر رہا تھا۔ جب سنبھلا تو میرے پوچھے بغیر ہی نماز جنازہ کے وقت اور مقام کی اطلاع دی اور میری طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

وہ شخص جو مر گیا تھا مجھے اس میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس میں مجھے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی؟ نماز جنازہ کب پڑھائی جائے گی اور کہاں؟ اسے کیسی موت مرنا چاہیے تھا اور کیسی نہیں؟ موت کی خبر کے پہلے دھچکے کے بعد میں اس طرح کے سوالات کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں نے سب کچھ اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اپنے آپ کو کام میں مگن رکھنا مشکل ہو رہا تھا لہٰذا وقت سے پہلے ہی دفتر سے نکل آیا۔

شام پڑنے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ سونیا سے بلا سبب اُلجھ پڑا۔ اسے شاپنگ کے لیے جانا تھا، اس نے گاڑی کی چابی مانگی اور شاید کچھ پیسے بھی۔ بالکل ویسے ہی لاڈ سے جیسا کہ وہ مطلب پڑنے پر اکثر کیا کرتی اور میں موم ہو جاتا۔ مگر ۔۔۔ میں تو وہاں ہوتے ہوئے بھی جیسے وہاں نہیں تھا۔ میرے اندر ایک عجب سی گونج تھی، ایسی گونج جو خالی پن سے اُٹھ رہی تھی۔ وہ اپنی بات کہہ چکی تو بھی میں اپنا سر جھٹک کر پوری طرح اس کی سمت متوجہ نہ ہو سکا۔ اس نے شاید اپنی چوتھائی یا آدھی بات دہرائی بھی مگر وہ ایک ایک جملہ کر کے بات کرتی تو بھی میں سن نہ پاتا کہ اندر کے گونجتے خالی پن نے میری سماعت میں عجب طرح کے رخنے رکھ دیے تھے۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہو پایا تھا کہ میں اس کی بات ڈھنگ سے نہیں سن پا رہا تھا۔ اس نے چڑ کر مجھے

www.urduchannel.in

اماں کی طرح ٹکر مار لینے والی چوٹ لگائی۔ مجھے یہ والا جملہ بالکل صاف سنائی دے گیا تھا، گونجتا ہوا جملہ۔ یوں، جیسے تانبے کے کٹورے میں اچانک کانچ کی گولی پڑی اور اوپر اچھلی تھی۔

کچیا۔۔۔اماں دیا بچیا۔۔۔اماں گئی پانی۔۔۔رُل گئی سیانی

گولیاں اچھل رہی تھیں۔ اور مجھے کچھ بجھائی نہ دے رہا تھا۔ ایسا طنز وہ پہلے بھی کر لیتی تھی اور میں ہنسی میں ٹال دیا کرتا مگر اس روز میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں پوری شدت سے چیخنا چاہتا تھا اور چیخا بھی۔ میں اس پر ہاتھ نہیں چلانا چاہتا تھا مگر یوں چیخنے پر وہ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے زور سے پرے دھکیل دیا۔ اب اس کے چیخنے چلانے کی باری تھی۔ ایسے میں میں وہاں کیسے رک سکتا تھا۔ لہٰذا باہر نکل گیا۔

گاڑی کو اگنیشن دیتے، ریورس گیئر میں ڈالتے، باہر سڑک پر لاتے یا پھر عین اپنے پرانے والے مکان کی کھڑکی کے سامنے رکنے تک میں بالکل خالی الذہن تھا۔ بلا ارادہ ہی ادھر نکل آیا تھا۔ جب گاڑی رُک گئی اور میری نظریں اس کھڑکی پر کچھ لمحوں کے لیے رکی رہیں تو نہ جانے کیوں میرے اندر محمود کی سسکاری گونجنے لگی۔

اسے ایسی موت نہیں مرنا چاہیے تھا۔

میں نے چونک کر پوری طرح گردن گھمائی اور ادھر دیکھا جہاں سے اشعر آیا کرتا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحہ بڑی سرعت کے ساتھ بند کھڑکی کی جانب دھیان منتقل ہو گیا اور محسوس کیا جیسے اس کھڑکی کے ادھر سے کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا جی چاہنے لگا' گاڑی سے اُتر کر اُس کھڑکی کے قریب جاؤں۔ میں نے دل کی بات مان لی۔ کھڑکی کو چھوا تو جیسے دوسری طرف سے کسی نے طاقچوں کو پورا زور دے کر بھیڑ رکھا تھا۔ میں نے اپنی ہتھیلیاں طاقچوں پر پھیلا کر رکھ دیں۔ اماں نے بھی جیسے ادھر سے عین وہیں اپنی ہتھیلیاں پھیلا کر رکھی تھیں، باہر کو زور دینے کے لیے، مجھے ادھر دھکیلنے کے لیے جدھر سے وہ آیا کرتا۔

وہ، جسے بیٹے کی محبت نے مار ڈالا تھا۔

میں نے جارحیت دکھائی۔ اماں پنجوں کے بل ہو گئیں اور مزاحمت میں سارا زور اپنی

ہتھیلیوں پر ڈال دیا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ میں نے کتنی دیر زور آزمائی کی تھی۔ تاہم مجھے پسپا ہونا پڑا۔ اور جب میرے قدم خود بہ خود ادھر اٹھ گئے، جدھر اماں دھکیل رہی تھیں، بازار کو چیر کر پار نکلنے والے راستے پر، تو مجھے لگا، جیسے میرا پتھر وجود گھس گھس کر اس گینی جیسا ہو گیا تھا جو اماں کی سیدھی ہتھیلی پر اوپر کو اچھلتی اور الٹی پر آ کر ٹھہر جاتی تھی۔

××÷××

www.urduchannel.in

خالی بٹوا

اب تو عید اور گرتی ہوئی لاشوں کا ایک ساتھ تصور باندھا جا سکتا ہے۔

مگر ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ عید یوں نہیں آیا کرتی تھی۔ تب رنگوں کی اور خوش بوؤں، خوشیوں کی پھوار انسانی وجود کے باطنی آفاق سے برسا کرتی تھی، یوں کہ سارا ماحول اس میں بھیگ بھیگ جایا کرتا۔ یہ کچھ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، بس یوں کہیے کہ تب کی بات ہے جب ایک بے گناہ قتل ہوتا تو چاروں کھونٹ میں سنسنی سرایت کر جاتی۔ اُفق سرخ ہو جاتا اور لوگ سہم کر استغفار کرنے لگتے کہ تب ایک بے گناہ کا قتل، انسانیت کا قتل ہوتا تھا اور لوگوں کو یقین ہوتا کہ یہ قبیح عمل قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ اب تو پے در پے قیامتیں کچھ اس طرح ٹوٹی ہیں، کہ بچوں کو بھی باہر نکلتے دیکھتے ہوئے دل کانپتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں وہ کمپیوٹر پر بیٹھے رہیں، مانیٹر پر نظریں جمائے گیمز کھلیں، نیٹ سے چپکے چیٹ کرتے رہیں، ٹی وی پر کئی کئی بار دیکھی ہوئی فلمیں اور کارٹون دیکھیں یا نیوز چینلز کے اینکرز اور سیاست دانوں کے درمیان ہونے والی نورا کشتی دیکھیں، میوزک چینلز پر سر اور آہنگ سے بے نیاز ہو جانے والی بے ہنگم موسیقی سنیں یا پھر ہم کچھ زیادہ ہی ان پر مہربان ہوں تو انھیں افغانی برگر، چائنیز سوپ، رشین سلاد اور اب تک ملٹی نیشنل ہو جانے والا پیزا کھلانے لے چلیں۔

پہلے عیدیں ایسے نہیں آیا کرتی تھیں۔

مجھے یاد ہے، پنڈی گھیب میں محلّہ ملکاں والا اپنا گھر، جو خوشیوں سے لبالب بھر جایا کرتا تھا؛ یوں، جیسے آپ پیالے میں نور جیسا اجلا دودھ اُنڈیلتے جائیں اور وہ کناروں تک بھر کر چھلکنے لگے۔ تب ہم اپنی آنکھ سے بھی عید کا چاند دیکھ لیا کرتے تھے، اور اگر نہ بھی دیکھ پاتے تو جن لوگوں نے دیکھا ہوتا اُن کی شہادت پر ہمیں ایمان جیسا اعتماد ہوا کرتا تھا۔ رمضان المبارک کے پورے مہینے میں تواتر سے سحری کے اوقات میں جگانے والے بھانڈوں کی پارٹی، چاند نکلتے ہی گلی میں پہنچ جاتی تھی۔ یہ وہی پارٹی ہوتی جو ڈھول یا کنستر بجا کر گلی سے گزرا کرتی تھی، اور جنھیں بھانڈ کہنے پر ابا اکثر ناراض ہوتے اور کہا کرتے، جس نام سے کوئی پہچانا جانا پسند نہ کرے، اسے اُس نام سے مت پکارو، انھیں فن کار کہو۔

ہمارا گھر جامع مسجد شیعیان سے جڑا ہوا تھا، جتنا مسجد کا صحن چلتا وہاں تک ہمارے گھر کی دیوار چلتی، مگر تب شیعہ سنی کے درمیان اس طرح کا بیر نہ تھا۔ مجھے یاد ہے، شروع شروع میں جب اس مسجد میں مجالس ہوتیں تو شہر بھر کی بیبیاں ہمارے گھر کی چھت پر مسجد کے صحن کی سمت والے جنگلے سے لگ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ہم نے ان کے مجلس سننے کا اہتمام پہلے سے کر رکھا ہوتا تھا۔ گھر کی ساری کھاٹیں اوپر چھت پر چڑھا دیتے، کم پڑتیں تو محلے بھر سے مانگ لایا کرتے۔ مجھے یاد ہے کھاٹیں ہم الٹی بچھایا کرتے تھے، یعنی پائے اوپر کو۔ پھر جب مجلس شروع ہو جاتی اور کربلا والوں کے ذکر پر الٹی پڑی کھاٹوں میں دھنسی ہوئی عورتوں کی سسکیاں سنائی دینے لگتیں تو شربت کی بھری بالٹیاں لے کر بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتے۔ یہ شربت اماں نے کھانڈ گھول کر پہلے سے تیار رکھا ہوتا، وہ اسے سبیل کہتی تھیں۔ یہ شربت ہم ان بیبیوں کو کمہاروں کی آویوں میں پکے ہوئے پیالوں (کہ جنھیں ہم ناسیں کہتے تھے) میں بھر بھر کر پیش کرتے تھے۔ تب دکھ سانجھے ہوتے تھے۔

ہاں تب دُکھ سانجھے ہوتے تھے، اب کچھ بھی سانجھا نہیں رہا۔

تب دوسروں کے عقیدے کا احترام کیا جاتا اب عقیدہ کیا انسانی جان بھی محترم نہیں رہی۔ بات کہیں اور نکل گئی، میں بتانا چاہتا تھا، کہ اسی مسجد سے عید کا چاند نکلتے ہی، مسجد کی

www.urduchannel.in

خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے اور ساری عمر مجرد رہنے والا شبیر حسین مسلسل اعلانات کرنے لگتا۔ اس کی آواز جوش سے بھری ہوئی ہوتی۔ یہ اعلان صرف اپنے مسلک کی مساجد کا نہیں ہوتا تھا، سب مسجدوں اور عیدگاہ میں نماز عید کے اوقات کا بھی ہوا کرتا تھا۔

ان دنوں چاندرات کا ہنگامہ بھی عجب رنگ پچکاری برساتا تھا۔ کھلے صحن کے بیچ دھریک کا چھتنار قدیمی درخت تھا۔ اس سے جھولا بندھ جاتا۔ جھولا باندھنے ابا خود دھریک پر چڑھ جاتے، ہم رسی اوپر پھینکنے کا مقابلہ کرتے، مگر وہ ابا کے ہاتھ تک نہ پہنچ پاتی۔ کئی حیلے ہوتے، حتیٰ کہ ابا کو کچھ اور نیچے آنا پڑتا تھا۔ اس سارے عرصے میں ہم لڑکوں کے اندر عجب طرح کا جوش بھرا ہوا ہوتا۔ بلاوجہ چیخنا، اچھلنا کودنا۔

''پکڑیے، اوہ، یہ تو آپ کا ہاتھ چھو کر نیچے آرہی۔''

''تم سے نہیں پھینکی جائے گی۔''

''مجھے دو۔''

غرض ایک ہنگامہ سا مچ جاتا۔ ادھر لڑکیاں، اس سارے عرصہ میں، ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے، گاتے گاتے گھوم رہی ہوتیں:

''بنے بنے وینیاں۔''

''اینگن مینگن، تلی تلینگن۔''

اور نہ جانے کیا کچھ۔ مگر جوں ہی پینگ بندھ جاتی، وہ اس پر ٹوٹ پڑتیں۔ اماں کہتی رہتیں کہ شام ڈھلے لڑکیاں دھریک تلے پینگیں جھولیں تو ان پر جن عاشق ہو جاتے ہیں، مگر وہ ایک نہ سنا کرتیں اور پینگ آسمان کے ستاروں کو چھونے لگتی تھی۔

ہمیں عید کی رات نیند کہاں آیا کرتی۔ ذرا ایک ایسے گھر کا تصور باندھیے، جس کے وسیع آنگن میں آسمان ہر رات، سارے تارے جھولی میں بھر کر، اترا کرتا تھا۔ عین وہاں جہاں سہ پہر ہوتے ہی پورے آسمان تلے کھلے آنگن میں چھڑکاؤ ہوا تھا اور شام پڑتے ہی بہن بھائیوں اور اماں ابا کی کھاٹیں ایک خاص ترتیب میں بچھا دی گئی تھیں۔ اُدھر اوپر کی سمت ابا

کے لیے، دائیں کو اماں اور باجی کے لیے، جب کہ بائیں کو، جدھر بکائن سے پرے ڈیوڑھی تھی، ہماری کھاٹیں۔ اوپر لینے کو سب کے پاس سفید چادریں تھیں۔ جب ہم ان چادروں کو تان کر عید سے پہلے والی رات سونے کا سوانگ بھر رہے ہوتے تو رات سارے تارے ان کی سفیدی پر انڈیل دیا کرتی تھی۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر یہ واقعہ ہے کہ تارے اُن اُجلی چادروں پر بھی لش لش کرتے رہتے تھے۔ ہمارے سونے کا ایک وقت مقرر تھا۔ نیند آئے نہ آئے ہمیں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ کر خاموشی سے نیند کا انتظار کھینچنا ہوتا تھا۔ چاندرات کو ایسا ہوتا مگر کچھ دیر بعد۔ نیند دبے پاؤں آتی، جس طرح ہر روز بلاناغہ آتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عین اس وقت، جب میں چمکتے تاروں کے آبدار کناروں کو اپنے تصور کی نازک پوروں سے ٹٹول رہا ہوتا تو رات مجھے اپنے آپ سے بےگانہ کر دیا کر دیتی۔ چاندرات کو بھی یہی وہ لمحات تھے جب آسمان کالا چغا پہن کر میرے قدموں کی سمت سے نمودار ہوتا اور اپنی بھری جھولی کے سارے تارے میرے اوپر بچھی دودھ جیسی سفید چادر پر ڈال دیتا تھا۔ یکا یک سارے میں تخ لو بھر جاتی۔ میں بےتابی سے تاروں کو ٹٹولتا جاتا۔ وہ مجھے اتنے نرم اور اتنے ملائم لگتے کہ اُن کا گداز میرے دل میں بھر جاتا تھا۔ ساری رات میں ان تاروں سے کھیلتا رہتا یا پھر اس چاند سے، جو آخری روزہ افطار ہونے کے بعد ابا کے کندھوں پر سوار ہو کر ان کی انگلی کی سیدھ میں نظر جمانے پر نظر آتا اور انگلی گراتے ہی غائب ہو جایا کرتا تھا۔

ہم چاندرات کو سیر ہو کر نہ سو پاتے تھے، مگر ابا یا اماں کی ایک ہی آواز پر یوں بستر چھوڑ دیا کرتے جیسے ہمارے بدنوں میں بجلی بھر گئی ہو۔ عید کی صبح ہمیں عام دنوں کی صبحوں سے بالکل الگ لگتی تھی۔ سارے میں جیسے خوشبو سی اٹھ رہی ہوتی۔ ایک دوسرے سے پہلے نہانے کے لیے کچھے پہن کر ہینڈ پمپ والی کوٹھڑی میں گھس جاتے۔ ابا نلکا گیڑتے اور ہم مل کر نہاتے کپڑے بدلتے، اماں پکڑ پکڑ کر سب کو عطر لگاتیں اور ہم دادا جان، ابا اور چچاؤں کے ساتھ عیدگاہ کی سمت نکل کھڑے ہوتے۔ اظہار الحق کو تو آپ جانتے ہی ہیں، جی وہی معروف شاعر، ان کے ابا مولوی تھے اور شاعر بھی، قاضی ظہور الحق وہ ہمارے ہاں عید کا خطبہ دینے فتح جنگ

www.urduchannel.in

سے آیا کرتے۔ وہ خطبہ دیتے اور مقامی بڑی مسجد کے امام صاحب نماز پڑھاتے۔ گویا دو الگ الگ مسالک والے یہاں بھی ایک ہو جایا کرتے تھے۔ نماز کے بعد قبرستان جانا اور گزر چکے پیاروں کے لیے دعا ہمارا معمول تھا۔ ابا اپنے بھائیوں میں چوں کہ سب سے بڑے تھے لہٰذا سب ہمارے ہاں اکٹھا ہوتے، دادا، دادی بھی ادھر ہی ہوتے۔ عید گاہ سے واپسی پر عید ملنے کا منظر بھی دیکھنے کے لائق ہوتا۔ تین بار پہلو بدل بدل کر گلے ملنا، بچوں کو ان کی پیشانیوں پر بے ریا چومنا اور محبت بھری دعاؤں کی پھوار برسا دینا ایسا معمول تھا کہ اس کا لطف ہی اب لگتا ہے ہم سے چھن گیا ہے۔ اب بھی خوشیاں آتی ہیں مگر اتنی پھس پھسی کہ لگتا ہے جیسے ان کے جسم سے روح نکل گئی ہو۔

نمازِ عید کے بعد ہم پلٹتے، دادی، اماں، چچیوں اور باجی کے قدم چھو کر انھیں عید مبارک کہتے، ان کے بوسے اپنے گالوں اور پیشانیوں پر ثبت ہوتے سے انھیں محسوس بھی کرتے۔ دسترخوان پورے برآمدے میں دور تک بچھا ہوتا۔ نیچے دری، اُوپر سفید چادر اور اس کے اُوپر پھول دار لمبی پٹی سا دسترخوان، جو اماں نے جولاہوں سے اس مقصد کے لیے بہ طورِ خاص بنوایا تھا۔ مکھڈی حلوہ اس دسترخوان کی خاص ڈش تھی۔ چاندرات کو اماں اس کے لیے سوجی بھگو دیتیں اور پھر پچھلے پہر ابا خود یہ حلوہ پکایا کرتے۔ سنہری ہو جانے اور اپنی مہک سے سارے گھر کو بھر دینے والا یہ حلوہ اماں کو پکانا بھی آتا تھا، ابا کے مرنے کے بعد اماں ہی پکاتی رہیں، مگر اس کے بعد جب بھی ہمارے ہاتھ اسے کھانے کے لیے بڑھتے ہماری آنکھیں ابا کو یاد کر کے بھگ جایا کرتی تھیں۔

عیدی میں دادا چار آنے دیا کرتے، تھوڑی بہت ابا اور چچاؤں سے بھی مل جاتی مگر ہمارے لیے یہی بہت ہوتی تھی۔ شہر سے باہر ایک نالہ پڑتا تھا، جو سال بھر ریت کا کھلیان رہتا مگر بارشوں کے موسم میں پانی سے بھر جاتا تھا۔ یہ نالہ ایک دوسرے مگر سال بھر بہے چلے جانے والے نالے، سیل میں جا گرتا تھا۔ ہم سیل کو دریائے سیل کہتے اور صرف بارشوں میں بہنے والے نالے کو ہروالہ۔ اسی ہروالے میں عید کے دو میلے لگا کرتے، اوپر کی سمت مردانہ اور نیچے ذرا فاصلہ پر زنانہ۔ میلہ کیا تھا، جلیبیاں، نگدیاں، مکھانے پکوڑے اور رنگ رنگ کی سنگتریاں اور بچوں کے

سستے کھلونے بیچنے والے عارضی دکانیں سجانے کے لیے وہاں ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے، جھولے نصب ہوتے، چیچ مکوڑے لگائے جاتے۔ بعد میں بیلوں کی دوڑ بھی اس میلے کا حصہ ہوگئی۔ سادگی تھی مگر اس سادگی سے زندگی کا خالص چہچہا برآمد ہوا کرتا تھا۔ مگر اب یوں لگتا ہے کہ عیدیں خوشیوں، خوش بوؤں اور محبتوں سے اس طرح خالی ہوگئی ہیں کہ سینہ خالی کنستر کی طرح بجنے لگتا ہے۔

ایسا کب سے ہو رہا ہے؟ میں اس کی کھوج میں پلٹ کر پیچھے دیکھتا ہوں اور مجھے ایک دھندلا سا واقعہ یاد آجاتا ہے۔ ہوا یوں تھا کہ ہم کچھ بڑے ہو گئے تھے۔ ہمیں عیدی بھی زیادہ ملنے لگی تھی۔ ادھر عید پر لگنے والے میلے میں بھی دکانیں بہت زیادہ ہوگئی تھیں۔ نئے نئے اور جی لبھانے والی اشیا سے بھری ہوئی دکانیں۔ اس سال کہ جس کا یہ بھولا ہوا واقعہ مجھے یاد آرہا ہے، میں میلے سے لوٹتے ہوئے اس طرح کی مسرت اپنے بدن میں محسوس نہ کر رہا تھا، جس طرح ہمیشہ کرتا آیا۔ یوں نہیں ہے کہ میں خوش نہ تھا، میں خوش تھا کہ میں نے اپنی مرضی کا ایک خوب صورت بٹوا خریدا تھا، مگر ایک عجب طرح کا افسوس قطرہ قطرہ دل کے اندر گر رہا تھا کہ میں جھولے پر بیٹھ سکا تھا نہ چیچ مکوڑا جھولا تھا، جلیبیاں، مکھانے بتاشے، ریوڑیاں، کھلونے کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک خوب صورت بٹوا، جسے دیکھتے ہی میرا ہاتھ اس کی طرف لپکا تھا۔ اسے چھوتے ہی نرم چمڑے کا گداز مجھے خواب میں چھوئے جانے والے ستاروں کی طرح لگا تھا، میلے سے واپسی پر اور آنے والے دنوں میں کہ جب جب میں اسے دیکھتا مجھے لگتا میرے اندر قطرہ قطرہ گرنے والا دکھ جھیل بن چکا ہے۔

بٹوا نیا تھا خوب صورت، نرم اور گداز بالکل ایسا جیسا کہ آسائشوں کی بوتے پر اُجلی نظر آنے والی یہ زندگی۔ لش پش کرتا بٹوا میری جیب میں رہا، میں اسے چھوتا رہا مگر اسے کھول کر دیکھتا تو اس کا خالی پن میرا منہ چڑا رہا ہوتا۔ میں نے ساری عیدی اس بٹوے پر لٹا دی تھی، مگر بدلے میں اتنی بھی خوشی نہ پا سکا جتنی کہ عید گاہ جاتے ہوئے ''چاچی، چاچی'' کہنے پر گالیاں دینے والی بڑھیا کے ہاتھ پر اپنی جیب سے دھیلا نکال کر رکھتے ہوئے پایا کرتا تھا۔ اور اب لگتا ہے زندگی بھی اس خوب صورت بٹوے جیسی ہوگئی ہے، جو ہماری سارے پونجی کھا جاتی ہے مگر دھیلے میں آجانے والی خوشی بھی ہمیں عطا نہیں کر پاتی۔

××÷××

www.urduchannel.in

گندی بوٹی کا شوربا

آدھی رات ادھر ہوگی اور آدھی اُدھر کہ ملک زین خان کی آنکھ کھل گئی۔

آنکھیں چوپٹ کر کے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش اسے جلد ہی ترک کر دینا پڑی کہ پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تیز بساندھ سانسوں میں گھسے جاتی تھی۔ بستر کے گیلے پن کی ساری حدت ختم ہو جانے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا پیشاب خطا ہوئے خاصا وقت گزر چکا تھا۔

ملک زین خان بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دینا چاہتا تھا۔ عمر کی اس منزل تک آتے آتے اسے ضبط کرنے کی عادت ہو چلی تھی، لہٰذا وہ رو نہ پایا۔ بچپن کا زمانہ بھی کیا خوب ہوتا ہے، اس نے سوچا۔ تب اسے رونے کی جو کامل آزادی تھی، اس پر اسے رشک آیا۔ خواب میں پہنچ کر بالکل اسی طرح نرم گرم بستر پر اپنا پورا مثانہ خالی کر دینا اور گیلے پن کی کاٹ سے بچنے کے لیے پاؤں مار مار کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے کا لطف اُٹھانا۔

کاش وہ گیلے پن سے چونک کر یک لخت رو سکتا، بالکل اپنے بچپن کی طرح۔

جسے وہ اپنا بچپن سمجھ رہا تھا وہ محض اس کا اپنا بچپن نہیں تھا، اس میں اب اس کے بیٹے نبیل کے بچپن کی یادیں بھی گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ جب نبیل اس عمر میں تھا جس کا وہ تصور باندھ رہا تھا تو وہ بہ قول آپا خیری کے اپنے باپ کی طرح اپنے آپ کو گیلا کر کے آسمان سر پر اُٹھا لیا کرتا تھا۔

بہت جلد بے اختیار رونے کی خواہش کی لذت، شرمناک طلب بن کر اس کے حلق میں

پھنسی ہوئی تھی اور حلقوم سے محض ہونٹوں تک کی راہ میں بڑھاپے کا وقار جھجک بن کر حائل ہو گیا تھا۔

اس نے عمر بھر کے سدھائے ہوئے ضبط میں تانبے کی طرح بجتی ہوئی چھاتی کو دبایا اور اپنے رقیق ہو چلے دھیان کو کسی اور طرف بہکانا بہلانا چاہا مگر بستر کے ریشے ریشے میں گھس جانے والا گیلا پن اس کے بدن کے پوست کو پھاڑ کر گوشت کاٹ رہا تھا۔ اس کے متلائے ہوئے جی نے چاہا کہ بدن کی بستر سے لگی جڑی پشت اُچھال کر چپکاہٹ کو جھاڑتے ہوئے پہلو بدل ڈالے۔

فالج نے اس کا نچلا دھڑ مار رکھا تھا۔ دن کو جب وہ بہلا پھسلا کر اعضاء کو حرکت دیتا تو بعضے مان جاتے تھے مگر صبح ہی صبح بدن میں پڑا کثیف کسل اضافی بوجھ بن جاتا تھا۔ وہ بازوؤں اور کندھوں کے زور پر نچلا بدن تھوڑا بہت گھسیٹ لیا کرتا مگر اب جو زور لگایا تو اسے لگا جیسے اوپر والا بدن، جو وہیں پڑے پڑے سن ہو گیا تھا، بس ایک لمحے کو تھرا کر ساکت ہو گیا۔ دوسری بار ہمت کر کے اس نے اوپری دھڑ کو اتنا جگا لیا کہ کمر اور چوتڑ قدرے اُوپر اُٹھ پائیں۔ تاہم ایسا کرنے کے بعد اسے شدید مایوسی ہوئی کہ اس کے نیچے گھسا ہوا گیلا پن اس کے وجود سے چپکا ہوا اوپر اٹھ آیا تھا۔ اس بے نتیجہ مشقت میں اس کی سانسیں اُکھڑ گئیں۔ کمرے میں بھری ہوئی گیلی سڑاند نے اس کے اکھڑے ہوئے تنفس پر بلہ بول دیا۔ سانسوں میں رخنے پڑنے لگے تو اپنی بے بسی پر اس کے آنسو نکل آئے۔

× ÷ ×

ماں سرِ شام پیڑھی اٹھائے اٹھائے اندر آتی، چارپائی کے پاس پہنچ کر قدرے بلندی سے اسے نیچے پھینکتی۔ پیڑھی کے چاروں پائے سیدھے بھوسہ ملی چکنی مٹی سے لپے ہوئے کچے فرش پر جا کر جم جاتے تھے، یوں کہ وہ چاروں پائے وہیں سے اُگے تھے اور جب ان کے تنے منہ بھر ہو گئے تو انھیں زمین سے بالشت بھر چھوڑ کر اُوپر سے کاٹا گیا اور اُن کے سروں میں اِسی لکڑی کے گول سیر دھنوس کر کھردری سونج سے بے دھیانی سے بُن دیا گیا تھا۔ اس بُنائی میں کہیں تانے کے کئی گھر چھوٹ گئے تھے اور کہیں بانا اوپر ہی اوپر تیر گیا تھا۔

www.urduchannel.in

تو یوں تھا کہ اس گھر کے بہشتی سائیں کے مرنے کے بعد یہاں زندگی بھی اس پیڑھی کی موئج کی بُنائی جیسی ہوگئی تھی، کہیں تانے چھوٹ جاتے اور کہیں بانا اوپر ہی اوپر تیر جاتا۔

کچھ عرصہ پہلے تک جب ماں یوں آیا کرتی تھی تو اس کے بدن میں عجب طرح کا خروش اور لذت بھر جاتی تھی۔ یہ لذت اس دودھ کی تھی جس کی میٹھی، ریشمیں اور نیم گرم دھار اس کے تالو کو چوم کر اس کے حلقوم میں اُترتی تھیں۔ اور جوش اس لمس کا تھا جس نے اس کے ننھے منے وجود کو سمیٹ لینا تھا۔ بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ کچھ بدل گیا تھا۔ ماں جو ہر بار قمیض کو ذرا اوپر کھسکا کر اس کے پہلو میں لیٹنے اور اسے نرم گرم آغوش میں سمیٹنے آیا کرتی تھی، رات گہری ہو جانے پر ہی ایسا کر پاتی۔ اس کا جسم پوری طرح بیدار ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا۔ اور وہ اس کے سونے سے پہلے بے سدھ ہو جایا کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ اُسے اندازہ ہو چلا تھا کہ پیڑھی اُٹھا کر ماں کے یوں آنے کے کیا معنی ہو سکتے تھے۔ ماں کی ناراضی سے بچنے کے لیے وہ مشاقہ ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ پھر اہوا مشاقہ خود بخود نیچے کو زور کرنے لگتا اور ماں پیڑھی پر بیٹھتے بیٹھتے اس کا لنگوٹ پیچھے سے کھینچ کر نیچے تک کھسکاتے ہوئے، جب اپنے دونوں ننگے پاؤں کے اندر اس کے چوتڑ نصب کر کے ''شی شی'' کرنے لگتی تھی تو وہ دھار بنا دیا کرتا۔ یہ دھار دیکھ کر ماں کا ٹوٹا ہوا بدن جیسے جُڑ کر کھل اُٹھتا تھا۔ وہ ہنستی اور کچھ کہتی تھی۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ ماں جو کہتی تھی اسے ٹھیک طرح سمجھ نہیں پاتا تھا تاہم وہ اس کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ ماں اس دھار کے نکلنے کے بعد مطمئن ہو جاتی تھی۔

جس روز ماں اسے پاؤں پر بٹھانا ہی بھول جاتی! اس روز، رات گئے کسی لمحے میں، اُسے یوں لگتا جیسے ماں کے ننگے پاؤں کے درمیان اس کے چوتڑ ہوں۔ ایسے میں اسے اپنے اوپر کوئی اختیار نہ رہتا تھا۔ جب یہی گیلا پن ماں کے نیچے گھس جاتا تھا اور وہ بڑبڑا کر اٹھتے ہوئے اسے بھی اٹھا دیتی تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ ماں اس وقت خوش نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب اسے چیزوں کی سمجھ آنے لگی تو اس ناخوشی سے بچنے کے لیے ذرا سی بوند نکلنے پر جاگ جانے اور خود کو گیلا ہونے سے بچانے کی آخری حد تک کوشش کیے چلے جانا سیکھ گیا تھا۔ تاہم

جب ضبط جواب دے جاتا تھا تو وہ بلک بلک کر رونے لگتا۔

ساری عمر کا سینت سینت کر رکھا ہوا ضبط جواب دے گیا تھا، ملک زین خان ایسی خجالت میں پڑ چکا تھا کہ بے بسی سے عین اس لمحے کی زندگی کا موت سے تقابل کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اس نے خود کو یہ فیصلہ دینے پر مجبور پایا: اس سے کہیں بہتر تھا وہ مر جاتا۔

اسے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیاں ہاتھ مسلنے اور ہتھیلی کی پشت کو ناخن سے کھرچ ڈالنے کی شدید طلب ہوئی مگر دائیاں ہاتھ، جہاں تھا وہیں پڑا رہا، ان کی اپنی موت کی طرح جو ان سے بے نیاز، ڈراہٹ کر مگر جسم سے پیوست پڑی تھی۔

آہ! مرنا بھی اتنی شدید خواہش کے باوجود ممکن نہ رہا تھا۔

ملک زین خان بڑبڑایا اور بے بسی سے بائیں ہاتھ سے دائیاں نوچنے لگا: یوں جیسے وہ اسے نہ نچوا رہا تھا اس میں خوابیدہ پڑی موت کو جگانے کے جتن کر رہا تھا۔

×÷×

وہ ابھی زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اپنے وجود کو تازہ اور اُجلا رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس گھر کے دھندے ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے۔ چوکسی سے ایک ہی ایڑھی پر گھومتے گھومتے اس کا سارا وجود انگڑ کھنگڑ سا ہو گیا تھا۔

''میں کل اٹھ کر سب سے پہلے اپنے جثے پر پانی بہاؤں گی۔''

سونی نے رات بستر پر جانے سے پہلے، صبح منھ اندھیرے اُٹھنے، اور نیم گرم پانی سے نہانے کا اہتمام کیا۔ ہانڈی توے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے جلتی لکڑیوں کو چولھے سے باہر نکالنے، اور ان پر پانی کے چھینٹے پھینکنے کی بہ جائے، وہیں جھنک کر راکھ جھاڑ دی۔ انھیں چولھے میں آگے تک گھسیڑ کر آنچ کو بڑھا لیا۔ ایک ہتھیلی پر پورے بدن کا بوجھ ڈالتے ہوئے اپنا چہرہ وہاں تک لے گئی تھی جہاں گوبر کی خشک اپلیاں اور کیکر کی چواتیاں مل کر نیلے شعلے پھینک رہی تھیں۔ اس نے اپنے پھیپھڑوں میں ہوا جمع کر کے زور زور سے ان پر پھونکیں ماریں، حتیٰ کہ آگ بھڑک اُٹھی۔

www.urduchannel.in

”کوسے پانی سے سارا جثہ خوب مل مل کر اور رگڑ رگڑ کر دھوؤں گی تو میل اُچٹ کر بدن چھوڑ دے گی۔“

کوسے پانی سے اس کی مراد نیم گرم پانی تھا، جب کہ اس نے جتنی آگ دہکالی تھی اس سے لگرائے، بل کہ جسے پانی کو بھی کھولایا جا سکتا تھا۔ سونی نے گھی کا خالی کنستر اٹھایا اور صحن عبور کر کے گھڑونجی تک پہنچی۔ اس نے اتنی عجلت میں صحن عبور کیا تھا کہ اس کی دھک دھکی کے نیچے سانس بجنے لگا۔ اس نے سہارا لینے کے لیے ایک گھڑے پر اوندھی پڑی ٹاس پر ہاتھ رکھ دیا۔ اگر چہ سونی کے بدن کا ذرا سا بوجھ ہی ہاتھ پر آیا تھا مگر گھڑونجی ڈولنے لگی تھی۔ اس نے ٹاس پر پڑا ہاتھ کھینچ لیا، کنستر ایک طرف رکھا اور کسی خیال سے جھک کر باری باری چاروں پائیوں کو دیکھا۔ پھر ایک پائے کے نیچے قدرے گنجائش پا کر اس نے یوں ہی اکڑوں بیٹھے بیٹھے اپنے آس پاس کسی کنکر کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ کنستر پر چپکے ہوئے مار کے والے کاغذ کو ایک طرف سے اُچٹے ہوئے پا کر اُس نے کنکر پتھر ڈھونڈے کے ارادے کو ملتوی کر دیا۔ کاغذ کے اُچٹے ہوئے کونے کو چٹکی میں لے کر اس نے ترچھے رُخ پر زور لگایا تو وہ ایک چوتھائی اس کے ہاتھ میں آ کر پھٹ گیا۔ اس نے اندازہ لگایا؛ اتنا ہی کافی تھا۔ کاغذ کے اس ٹکڑے کو تہ کیا اور زور لگا کر اچھی طرح اس پائے کے نیچے وہاں گھسیڑ دیا جہاں اس نے گنجائش ڈھونڈ رکھی تھی۔

سونی نے گھڑونجی کو ہلا جلا کر تسلی کر کے اٹھنا چاہا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ ایک شدید درد کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کے قدرے نچلے حصے سے اٹھی اور پورے بدن میں کوندے کی طرح کود گئی تھی۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنا اٹھنا معطل کرنا پڑا۔ اگر چہ بعد میں اس نے پانی کا پورا گھڑا کنستر میں خالی کیا؛ پانی سے چھلکتے ہوئے کنستر کو ذرا ترچھا کر کے اس کے نیچے دونوں طرف سے آدھی ہتھیلی تک انگلیاں گھسا کر اسے اوپر تک اٹھایا' اپنی چھاتیوں پر جمایا اور پھر اس کی چھلکن روک لینے کو سہج سہج چلتی، چولھے تک آ کر بھڑکتی ہوئی آگ پر اسے دھرا تھا مگر اس درد کی چبھن اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھی۔ اُس نے کمر اکڑا کر بازوؤں کو اوپر اٹھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں بھی تناؤ پیدا ہو گیا۔ اُوپر اٹھے ہوئے بازو ہوا میں لہرانے اور تنی ہوئی

ٹانگوں کو آگے پیچھے جھٹکنے سے اُس کا جسم اپنے ڈھب پر آ گیا۔ تاہم جب وہ اپنے بستر پر لیٹی تو معدوم ہو چکے درد کا احساس ایک چبھن بن کر پھر جاگ اٹھا تھا۔

اس نے اس چبھن کو جھٹک دینا چاہا اور اپنے میل سے اٹے وجود کی بابت سوچا۔ بے خیالی میں خود کو ادھر اُدھر سے ٹٹولتے ہوئے جب اس کے ہاتھ چھلکتے پانی سے گیلی ہو جانے والی قمیض پر پڑے جو چھاتیوں پر چپک گئی تھی تو اس کے دھیان میں گھی والے وہ کنستر آ گئے جو منگنی والے دن اس نے چہرے پر لٹکائے ہوئے دوپٹے کے اندر سے بھی، ادھر صحن میں دھریک تلے پڑے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ اسے یاد آیا اتنا زیادہ بازاری گھی ایک ساتھ دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔ اس نے کنستر گنے تھے۔ ایک، دو، تین........

×÷×

ایک، دو، تین، ...، ...، چھ۔

ملک زین خان نے حساب لگایا اگلے مہینے کی پانچ کو نبیل کو گئے پورے چھ سال ہو جائیں گے۔

گزشتہ چھ سالوں میں وہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا تب بھی نہیں، کہ جب اسے گزشتہ برس اس کے باپ کے دائیں پہلو پر فالج کے حملے کی خبر دی گئی تھی۔ حالاں کہ اسے بہت تجسس ہوا تھا کہ معذور ہو کر اس کا باپ کیسا ہو گیا ہوگا۔ فالج زدہ لوگ اس کے مشاہدے میں آتے رہے تھے۔ جہاں کہیں زبان متاثر ہوتی تو کوشش کے باوجود بولنا مشکل ہو جاتا۔ اس نے تصور ہی تصور میں باپ کو زور لگا کر ایسا کرتے دیکھا اس کی زبان لڑکھڑاتی اُلٹ کر باہر آ گئی، پھر کہیں جا کر، اوں، آں، کی مہمل آوازیں نکل پائیں۔ ان آوازوں کے ساتھ ہی اس کے سر پر اٹھا سفید کلف اور ابرق لگا شملہ آگے پیچھے جھولنے لگا تو ہنسی کا گولا اس کے پیٹ سے اُٹھا اور اُس کی باچھیں چیرتا بہ نکلا تھا۔

جب تک ملک زین خان پر فالج کا حملہ نہیں ہوا تھا، تب تک اُسے نبیل کا یوں رہ رہ کر خیال نہیں آتا تھا۔ وہ اتنا معذور نہ ہو جاتا تو شاید وہ اس بابت سوچتا ہی نہ کہ اس کے بیٹے کو

www.urduchannel.in

اسے خط لکھنا چاہیے۔ مگر اب وہ شدت سے اس کے خط کا انتظار کرنے لگا تھا۔ دو تین سطروں والا خط ہی سہی۔ چاہے وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ہو، مگر وہ لکھے ضرور۔ یوں جیسے ایک بیٹا باپ کو لکھتا ہوگا۔ لوگوں کہتے تھے، بیماری کے بعد اکیلے اور لاچار ہو جانے والے ملک زین خان نے بیٹے کی جدائی کا دُکھ اپنے دِل پر لے لیا تھا۔ یہ بات اس کے احباب یوں کہتے تھے کہ جب بھی وہ اسے ملنے آتے اور اس کے نبیل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ ہونٹ سختی سے باہم دبا لیا کرتا۔ اتنی سختی سے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑتے۔ پھر یوں ہوا کہ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو ملے بغیر واپس کرنے لگا۔ وہ اندر سے گھن لگی لکڑی کی طرح کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا۔

نبیل باپ کو دیکھنے چلے آنے کا فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ سونی کو ماں کے روپ میں نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چاچا رکھے کو کہہ دیا ابا کو شہر کے بڑے ہسپتال میں ڈال دے۔ رکھا ملک زین خان کا منشی تھا۔ سارا حساب کتاب اسی کے ہاتھ میں تھا۔ نبیل کی ضروریات بھی بہ ظاہر ابا کے حکم پر وہی پوری کرتا۔ تاہم ایسا تاثر دیتا کہ وہ یہ سب کچھ چپکے سے کر رہا تھا۔ شاید رکھے کی اسی چال نے اسے اس کے لیے پسندیدہ شخصیت بنا دیا تھا مگر بعد میں وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا کہ وہ اسے بے ایمان اور چور سمجھنے لگا تھا۔ ایسا آدمی جو مالک کے مال کو موقع ملتے ہی چوہے کی طرح کتر رہا ہو۔

جو کترنے والا چوہا تھا، اس کا پیٹ بھی چوہے کے پیٹ جتنا ہی ہوگا لہٰذا ایک بار پھر بے ایمان رکھا کارآمد ہو گیا تھا۔ ایسا آدمی جو اس لیے برداشت کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس کے باپ کو سنبھال سکتا تھا۔

×÷×

''کاش وہ اپنے باپ کے مرنے تک نہ آتا۔''

سونی کے ذہن پر دبیز دھند چھائی ہوئی تھی مگر اس نے ایسا پھر بھی سوچ لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ مصروف تھے۔ اپنے کندھوں کو دباتے دباتے اس کی انگلیاں پھسل کر جب بغلوں کے اندر اُتر گئیں تو اس نے وہاں بڑھے ہوئے بالوں پر جم جانے اور پسینے سے بار بار

بھیگ کر کھردری ہو جانے والی میل کی تہوں کا اندازہ لگایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے آنکھوں کو مچ مچا کر ناک کو اوپر تک کھینچ لیا کہ کھردری میل کی گیلی بساندھ کا تصور اس کی ناک کی ہڈی کے اندر کوے کی طرح ٹھونگیں مار رہا تھا۔ اپنے آپ کو اس طرح ٹٹولتے ہوئے اس نے ادبدا کر دائیں بائیں ہاتھ کی اُنگلیاں انگوٹھے پر جمائیں اور ایک ساتھ سونگھ لیں۔ اس کا سارا معدہ حلقوم کی سمت اُلٹنے کے لیے زور کرنے لگا۔ اس نے اپنا پیٹ دبا لیا اور کلائیوں کے زور سے اسے دبائے رکھا حتیٰ کہ پیٹ کے اندر سے اوپر کو اُٹھتی اور اچھلتی ابکائی کا زور ٹوٹ گیا۔

اس کے ہاتھ ایک بار پھر نرمی اور نزاکت سے جسم پر تیرنے لگے۔ اسے، خود کو آہستگی سے، اور انگلیوں کو بدن پر تیراتے ہوئے چھو کر محسوس کرنا لطف دے رہا تھا۔ ایسے میں بدن پر چڑھی ہوئی میل کی تہوں کی بابت سوچنا خود بہ خود معطل ہو گیا۔ ہاتھوں پر زور بڑھتا چلا گیا۔ وہ خود کو وہاں تک مسل کر جگاتی گئی جہاں تک اس کے ہاتھوں کا لمس جا سکتا تھا۔ وہ اردگرد سے پوری طرح بے نیاز ہو گئی تھی۔ اسی کیفیت میں پڑے پڑے اس کا دھیان نبیل اور اس کے باپ کی جانب ایک ساتھ گیا تھا۔ ایک عجب طرح کی اُلجھن اور اینٹھن میں گتھی ہوئی کیفیت اس کی نس نس میں کلبلانے لگی اور بے اختیار اس کے ہونٹوں پر پھسلا تھا۔

''کاش وہ اپنے باپ کے مرنے تک نہ آتا۔''

سونی کی زبان نفرت کے گاڑھے لعاب میں ڈوب گئی۔ چت لیٹے لیٹے اس نے گردن کو وسط سے یوں اُوپر اُٹھا کر کوس بنائی کہ اس کی کھوپڑی چوٹی پر ٹک گئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ اپنے سر کو تھوڑا سا دائیں جانب یوں گھمائے گی جیسے سرکنڈے کے سرے پر کاغذ کی بھنبھیری گھومتی ہے، تو جمع ہو جانے والا لعاب کا گولا، لیٹے لیٹے زمین پر پھینک سکتی تھی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی مگر زبان نے جیسے اس گولے کو کنڈلی مار کر جکڑ لیا تھا، یوں جیسے سرکنڈے کا سرا کاغذ پھاڑ کر بھنبھیری کو جکڑ لیتا ہے۔ اس کیفیت میں پڑے پڑے اس کی گردن اکڑ گئی تو اس نے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ چوٹی پر ٹکی کھوپڑی واپس پھسلنے لگی۔ اسے لگا، نہ چاہتے ہوئے بھی ساری نفرت اس کے حلقوم میں پگھل کر مر رہی تھی۔ اُسے اپنے

آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ ڈھنگ سے نفرت کرنا بھی سیکھ نہ پائی تھی۔

×÷×

وہ اپنے باپ سے نفرت کرنا چاہتا تھا؛ کاٹ کر رکھ دینے والی شدید نفرت۔ مگر ایک ایسے شخص سے جو آدھا مر چکا ہو اور باقی کا آدھا بھی مر رہا ہو اس سے بے پناہ نفرت ممکن نہ رہی تھی۔

''تمھارے باپ کا آدھا بدن مر چکا ہے۔''

چار چار کھے کے خط سے ایک جملہ الگ ہو کر اس کے اندر گونج رہا تھا۔

وہ ہفتے کی شام تھی اور ابھی کچھ ہی دیر پہلے رُتھ نے اُسے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ آ رہی تھی۔ اس نے بائیں کان کے نیچے گردن پر وہاں ہاتھ رکھا جہاں اس نے گزشتہ ہفتے پہلے تو زبان کی نوک سے گیلا دائرہ بنایا تھا اور پھر عین اس دائرے کے وسط میں اسے باؤلی کتیا کی طرح کاٹ کر بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ پورا ہفتہ گزر جانے کے باوجود وہ گردن پر اس ابھرے ہوئے نیم بیضوی حلقے کو محسوس کر سکتا تھا۔ اور وہ ایک لطف سے اسے محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں والوں کا فون آ گیا۔ وہ یہ فون نہیں سننا چاہتا تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی سُن بیٹھا تھا۔ فون سننے کے بعد اس نے ایک بار پھر رُتھ کو یاد کر کے اس الژبلز کیفیت سے نکلنا چاہا جو فون سننے کے بعد اس کے اندر موج زن بے پناہ نفرت میں رخنے ڈال رہی تھی۔ اسے رُتھ یاد آئی اور اس کا آدھے بدن کے بولنے والا جملہ بھی۔

پُر جوش اور چوکس رُتھ کا اگرچہ وہ بھرپور ساتھ دے سکتا تھا اور دیتا تھا مگر وہ پھر بھی ہر بار اک عجب ہنسی ہنستی تھی۔ بھرے جسم والی رُتھ کا ہنسنا اس کے سارے بدن سے چھلکتا تھا۔ ایک بار، جب اس کی سرسبز لدی ہوئی شاخوں جیسی پسلیاں ناف کے عین اُوپر گداز پیٹ میں اتر نکل رہی تھیں، اس نے چمچماتی نظر اپنے آپ پر ڈال کر اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ اُسے آدھے بدن والا کیوں کہتی تھی۔ اس کی ہنسی میں اس کی شرارتی سبز آنکھیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ کہنے لگی؛

''جب تم بول رہے ہوتے ہو نا، تو الفاظ تمھارے ہونٹوں سے اُچٹ اُچٹ کر آتے

www.urduchannel.in

ہیں، حلقوم کو خبر تک نہیں ہوتی اور باقی کا وجود بھی دم سادھے ایک طرف پڑا رہتا ہے۔''

سبز آنکھوں سے چھلکتی شرارت اب اس کے انگ انگ میں جھلک دینے لگی تھی۔

''اور ابھی کچھ دیر پہلے، جب تمھارا مُردوں کی طرح پڑے پڑا یہی وجود بپھرے ہوئے سانڈھ کی طرح تباہی مچا رہا تھا تو لگتا تھا، الفاظ تمھارے پاس تھے ہی نہیں۔''

اس نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے سارا منظر ان کے اندر بسا لینا چاہتی ہو یا پھر جو مناظر اس کے اندر آباد تھے ان میں پوری کی پوری بس جانا چاہتی ہو۔ نیل جھینپ کے جھما کے میں اسے بے پناہ محبت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں، اسے لگا جیسے وہ عین اس لمحے میں اس سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ ایک دم اس نے آنکھیں کھول دیں، تو نیل بوکھلا کر اُس کے کندھوں کے اوپر سے پرے دیکھنے لگا۔

وہ کھل کھلا کر ہنس دی، یوں کہ اس کا پیٹ دہرا ہو گیا۔

×÷×

اس نے چارپائی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے، گرم پانی سے لوٹا منہ تک بھر لیا اور اسے دھار بنا کر عین پسلیوں کے نیچے وہاں ڈالنا شروع کیا جہاں پیٹ دوہرا سا ہو رہا تھا۔ گرم پانی کی دھار اُوپر ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ اس کا جسم دائیں بائیں دو حصوں میں کٹتا چلا گیا۔ اس کی کھوپڑی اندر سے کھول رہی تھی۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ کاش کھولتا ہوا پانی ہوتا، مقابلے کا کھولتا ہوا پانی، اور اسے وہ اپنے چوٹی پر ڈالتی۔ ایسا سوچنے تک لوٹے کا سارا پانی وہ بدن پر بہا چکی تھی اس نے لوٹا کنستر سے بھرنے کی بہ جائے، اسے پرے پھینکا، چارپائی کے وسط میں اس کے ساتھ جھولتے کنستر کو جو ابھی تک آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا، دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور سر کے اوپر لے گئی اور سارے کا سارا ایک ہی بار میں اپنے سر پر انڈیل لیا۔ پانی اس کی توقع سے کہیں زیادہ گرم تھا، لوٹے سے دھار بن کر اس کے بدن کو چھونے والا پانی اپنی زیادہ تر گرمائش راہ میں ہی زائل کر دیتا تھا مگر یوں پانی ایک ساتھ گرانے سے اسے لگا جیسے اس کی کھال بھی بہتے پانی کے ساتھ اُترتی چلی گئی ہو۔ اس نے کنستر ایک طرف رکھ کر، اپنے بدن پر ہاتھ پھیرا اور اسے نیچے تک جانے دیا۔ یہ

www.urduchannel.in

سب کچھ اسے اچھا لگنے لگا۔ اسے اپنی جلد کسی نومولود بچے کی سی محسوس ہو رہی تھی، نرم، پوروں کے لمس کو گہرائی میں منتقل کرتی ہوئی اور اتنی شفاف کہ رگوں اور اس میں بہتے لہو تک کو دکھا سکتی تھی۔

جب وہ اپنی ماں کے ہاں تھی تو بھی اسی اہتمام سے نہایا کرتی تھی۔ وہاں اس طرح کا غسل خانہ نہ تھا جیسا کہ اس حویلی میں تھا۔ جب اسے یا اماں کو نہانا ہوتا، اکلوتے رہائشی کمرے کے اندر کچے فرش پر چارپائی رکھ لی جاتی، موسم کے اعتبار سے گرم یا ٹھنڈے پانی کا برتن چارپائی کے وسط میں جما کر وہ خود بھی جم کر پاس ہی بیٹھ جاتیں۔ اس طرح نہانے سے گیلے ہو جانے والے فرش کی مٹی سے وہ خود کو بچا لیا کرتی تھیں۔ حویلی میں فرش سرخ اینٹوں کا تھا، جسے جتنا رگڑ کر دھویا جاتا اتنا ہی سرخ نکلتا۔ یہ سرخ اینٹیں ملک کے اپنے بھٹے کی تھیں، ایک جیسی آگ میں پکی ہوئیں۔ یہی اینٹیں رہائشی کمروں کے فرشوں میں بھی تھیں، جن میں سے ایک کو چھوٹا اور دوسرے کو بڑا محل کہا جاتا۔

غسل خانہ صحن کے پار تھا اس میں پھولدار ٹائلیں لگی ہوئی تھیں، فرش پر اور دیواروں پر بھی۔ سونی کو اس کے اندر بند ہو کر نہاتے ہوئے گھٹن محسوس ہوتی تاہم جب سے وہ یہاں آئی تھی، اسی غسل خانے میں محبوس ہو کر نہاتی رہی تھی۔ یہ تو پہلی بار ہو رہا تھا کہ اس نے کمرے کے وسط میں بان سے بُنی گئی چارپائی بچھائی اور سارے کا سارا گرم پانی اپنے اوپر انڈیل کر خود پر چڑھی اس اذیت کو دھو ڈالنا چاہا تھا جو اسے ایک مدت سے نڈھال کر رہی تھی۔

×÷×

نبیل چاہتا بھی تو کتنی دیر پرے دیکھ سکتا تھا، ایک جیتے جاگتے بدن سے پرے۔ مگر وہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ اسے دروازے کی درزوں سے جھلک دینے والا سونی کا جسم نظر آ گیا، جس کے اُوپر سے پانی بہ کر اور دھار بنا کر دروازے کی دہلیز کے نیچے تک پہنچ گیا تھا۔

اُسے ایک بار پھر شہر جانا تھا۔ وہ گاؤں واپس نہیں آ رہا تھا مگر اس کی جیب خالی ہو گئی تھی۔ لہٰذا اُسے واپس آنا پڑا۔ واپس جانے سے پہلے چاچا رکھے سے ملنا ضروری تھا۔ فجر کی نماز کے وقت رانگڑوں کی بس ساتھ والے گاؤں سے ہوتی ہوئی ان کے گاؤں کے پاس سے

گزرتی شہر جاتی تھی، جو وہاں کسی روٹ پر چلتی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بس چھوٹ جاتی۔ وہ اپنے باپ سے اپنی ضرورت کا کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح روز روز شہر جانا اس کے باپ کو سخت ناپسند تھا۔ جب چاچا رکھے کی طرف جاتے ہوئے وہ شیدے مستری کے گھر کے پاس پہنچا، اسے دروازے کی درزوں سے چھلکتی دیئے کی مدہم روشنی نے روک لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پانی کے چھپاکا سنائی دیا، ایک۔ دو۔ اور تین۔

وہ تیسرا چھپاکا تھا جس نے اُسے دروازے کی درز میں آنکھ جمانے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب وہ چاچا رکھے کے پاس پہنچا تب تک وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اس کے بدن کے سارے مسام منہ کھول کر پسینہ باہر پھینک رہے تھے۔ دروازے پر کھڑے رہنے تک، حتیٰ کہ وہ نہا کر کپڑے پہن لے، پھر دروازہ کھٹ کھٹانے، اس کے چونک کر دروازے تک آنے، کنڈی کھولنے اور ''کون ہے، کون ہے'' کی تکرار حلق میں تر از و ہونے تک، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے یہ دروازہ کیوں کھٹ کھٹایا تھا۔ تاہم جب وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی تو اس نے ہمت کر کے بس اتنا کہا تھا، ''تم میری امانت ہو، سمجھیں۔'' وہ کچھ سمجھی تھی یا نہیں مگر اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا اتنا کہ اس کا وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ رہا۔

وہ چاچے رکھے کے گھر کی طرف چلتا چلا گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دروازے کے وسط میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں کو اس نے اپنی گردن پر محسوس کیا تاہم اس نے مڑ کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

شیدا مستری بہت پہلے مر گیا تھا۔ اور ابھی اس کا چالیسواں نہ گزرا تھا کہ اس کی بیوی بھی مر گئی۔ سونی کو نبیل کی ماں نے حویلی میں کام کاج پر لگا لیا۔ یوں وہ ایسی لڑکی تھی جو بچپن سے نبیل دیکھتا آ رہا تھا۔ مگر جس طرح اس رات دیکھا تھا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور جس طرح اُسے وہ اب محسوس کر رہا تھا پہلے اس کا اسے گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے کبھی اُسے آنکھ بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے مرنے کے بعد حویلی میں رکتا بھی تو کم کم ہی تھا۔

ایسا کم کم ہی ہوتا کہ اسے چاچا رکھے کو اپنی ضرورت منہ کھول کر بتانا پڑتی۔ وہ ''میرا

www.urduchannel.in

چھوٹا ملک جی، میں صدقے، ماں واری'' کہنے کے عرصہ میں ہی بنتے بنتے اُٹھا، اور اس کی ضرورت پوری کر دیتا۔ اب تک نبیل یہ جان گیا تھا کہ بعد ازاں بڑھا چڑھا کر بڑے ملک جی کے کان میں وہ سارا ماجرا ڈال کر اپنا حصہ الگ کر لیا کرتا تھا۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ اس کے باپ نے یہ اہتمام ایک فاصلہ قائم رکھنے کے لیے کیا ہوا تھا جو اس کی فہم کے مطابق باپ بیٹے کی آنکھوں میں حیا برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ وہ دن بھی اگر معمول کا ہوتا تو یہ حیا کا پردہ یوں ہی تار ہتا مگر اس روز اس نے سونی کو کسی اور ڈھنگ سے دیکھ لیا تھا۔ اور اسی روز اسے دیکھتے ہی عجب سی ہنسی بنتے ہوئے چاچا رکھے نے اُٹھنے کی بجائے اس کی طرف جھک کر بڑے ملک جی کے شیدے مستری کی بیٹی سے نکاح والے ارادے کا راز اس پر فاش کر دیا تھا۔

اس کا باپ ہمیشہ اپنے حال میں مست رہا تھا۔ زمینیں، مزارعے، پنچائتیں، اینٹوں کا بھٹہ اور نہ جانے کیا کچھ۔ اس نے ہمیشہ ماں کو کُڑھتے، باپ کا انتظار کرتے اور اس کی آمد پر غلاموں کی طرح جی جی کرتے، جب کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے روتے پایا تھا۔ باپ کے اس وتیرے نے نبیل کو اس قریب نہ ہونے دیا۔ اتنا قریب کہ وہ کبھی اسے چھاتی سے لگا لیتا۔ یہی سبب رہا ہوگا کہ وہ اپنے باپ سے محبت کا رشتہ نہ بنا پایا تھا مگر اب جب کہ چاچا رکھے نے سونی والی بات کہہ دی تھی اس کے اندر سے نفرت اُبل پڑی تھی شدید نفرت۔ اتنی شدید اور منہ زور کہ اس نے باپ کو اس کام سے روکنے کے لیے اسے قتل کر دینے کی شدید بات چاچا رکھے کے سامنے کہہ دی۔ چاچا رکھا جہاں دیدہ آدمی تھا اُس نے اُسے بہلا پھسلا کر کچھ دن کے لیے کچھ بھی نہ کرنے پر راضی کر لیا۔ اگلے ہی ہفتے وعدہ کے مطابق چاچا رکھے نے سب ٹھیک کرنے کی خبر دی دے۔ اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ کچھ عرصہ ولائت ہو آئے۔ وہاں سے واپس آنے تک وہ سارے معاملہ کو سنبھال لے گا۔

×÷×

اپنے دل کی وہ بات جو اب تک وہ کسی سے نہ کہہ پائی، اس کے اندر بھڑک بھڑک اٹھتی تھی۔ اسے جب سے یہ خبر ملی تھی کہ نبیل، جو اب اس کا رشتے میں بیٹا ہو گیا تھا، آ رہا تھا تو

اسے اپنا وجود خلا ظت میں لتھڑا ہوا لگنے لگا۔ بڑے ملک جی سے شادی ہونے اس کے فالج سے معذور ہونے اور اپنی طرح اکیلے ہو جانے کے اس سارے عرصہ میں اس نے نبیل کی بابت بہت سوچا، عجب ڈھب سے اور ہر بار تھو تھو تو بہ کر کے اس نے اپنی چادر سے اپنا سارا جسم یوں ڈھانپ لیا جیسے اس کی اپنی ماں ڈھانپ لیا کرتی تھی۔ مگر اب جب کہ وہ آ رہا تھا اسے اپنے بدن کی میل تک بوجھ لگنے لگی تھی۔ اس نے میل رگڑ رگڑ کی صاف کی اور آخر میں سارے کا سارا گرم پانی اپنے سر کے اوپر لا کر بہا دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے بڑے محل سے ملک زین خان کے دھپ سے سرخ اینٹوں کے فرش پر گرنے اور شدید کراہنے کی آواز سنی تھی۔ وہ بوکھلا کر اٹھی۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی بجائے اسے سنبھالنے کے لیے۔ اور لپک کر بڑے محل میں پہنچ گئی۔

×÷×

سارے کمرے میں تہ در تہ بھری ہوئی دُھند لاہٹ اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگی تھی۔ شاید اُس کی کمر ٹوٹ گئی تھی کہ وہاں سے درد فوارے کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ درد کی شدت کو دبانے کے لیے کراہنا چاہتا تھا، زور زور سے، مگر اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کا نرخرہ کاٹ دیا گیا ہو۔ ایسے میں اس نے ماں کے شفیق ہاتھوں کو اپنے کندھوں اور رانوں تلے محسوس کیا، یوں جیسے وہ اُسے اٹھا کر اپنے قدموں کے بیچ بٹھا لینا چاہتی ہو۔ کمر کا درد اور بھی شدید ہو گیا تھا مگر ماں کے ہاتھوں کا لمس پا کر اس نے محسوس کیا جیسے ایک بار پھر اس کا بھرا ہوا مثانہ نیچے کو زور مارنے لگا تھا۔ اس نے مثانہ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کمر کا سارا درد دھار بنا کر بہ نکلا تو اس کا جی للچانے لگا کہ اس کے حلقوم میں مینھی، ریشمیں اور نیم گرم دھار کی لذت اُتر ے۔ اس کا تالو چومتی ہوئی۔

دھار ابھی نہ ٹوٹی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایسی دستک، کہ وہ فالج زدہ وجود تھا یا جوان اور اُجلا، دونوں اُس کی دھمک سے لرزنے لگے تھے۔ ایسے میں کسے خبر تھی کہ ایک ڈھلے ڈھلائے جسم کی شفاف جلد پیشاب کی بنتی ٹوٹتی متعفن دھار سے بھیگ رہی تھی۔

××÷××

www.urduchannel.in

تَن کی لذّت

فی الحقیقت حضرت مولانا سراج الدین تحور ملالوی کے لیے خود اپنی ذات کے توسل سے جنت اور دوزخ کا سوال بے ڈھب پھیلتا اُونٹ کٹارا تھا، سارے کا سارا کانٹوں بھرا قریب جاؤ تو دامن تھامے اور تھامے رہے۔ حیلہ کر کے چھڑا لینا چاہو تو زنبور بنے اور اُلجھا لے۔ زورآوری کرو تو دامن ہی تھگلا تھگلی کر دے۔ تاہم یہ سوال اُن کے وجود کے لیے یوں تھا جیسے کبوتر کے لیے اُس کے پاؤں میں پڑی پنجنی۔ کبوتر چاہے جتنی دھیرج سے چلے پاؤں کی پنجنی جھن ضرور کرتی ہے۔

یہی وجہ رہی ہوگی کہ شروع شروع میں جب بھی جنت دوزخ کے سوال کی سرعت سے گھومتی پرکار سوئی ان کی چھاتی کو مرکز مان کر پوست ادھیڑتی، ماس چیرتی، عین من کے بیچ کھب جاتی تو دائرے کی صورت گھومتا، لکیریں ڈالتا مستبام سراپر سے ہی ٹھٹھک کر ٹھہر جاتا۔ مولانا ملالوی اس سوال کو سامنے پا کر اُلجھ جاتے، اُلجھن سے تو سر جھٹک دیتے اور بار بار جھٹکے جاتے۔ بالکل یوں جیسے پہلی جُھن پر کبوتر جھل مرے کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، پھر پاؤں جھٹکتا ہے اور جھٹکے چلا جاتا ہے۔

کون جانے، وہ کون سا کفیان لمحہ تھا کہ ان کی روح پر پڑی چونک کی کفنی خود بخود مسک گئی تھی۔ اوّل اوّل بس اتنی ہی مسک چاہیے ہوتی ہے بعد ازاں تو روح اسی مسلسل مسک کی

پھنک کی اسیر ہو جاتی ہے۔ جنت دوزخ کا سوال غٹ غوں، غٹ غوں کرتے اور اپنے ہی محور پر پلٹیں ڈالتے کبوتر کی جھن کی طرح مولانا ملالوی کے لیے جھنجھنیاں بن گیا جو جکڑے ہوئے بھی تھا اور حلاوت بھی دیتا تھا۔

پھر جب اسی جکڑ کی حلاوت روح کا وظیفہ ہو گئی تو رفتہ رفتہ اُن کے بدن کے خلیے خلیے میں مستی بن کر سمانے لگی۔ مولانا ایسے میں بے خود ہو جاتے، دستار کلاہ سمیت دونوں ہاتھوں سے تھام کر اُتارتے اور اپنے سامنے رکھ لیتے۔ مقتدی سمجھ جایا کرتے کہ حضرت مولانا وجد میں آیا چاہتے ہیں۔ سب خاموش ہو جاتے حتیٰ کہ وہ حال کے جذب سے اُبھرتے اور قبلہ رُخ ہو کر سربہ سجود ہو جاتے۔

جب مولانا ملالوی اس استغراقِ حال سے نکلتے تو قال اور صدقِ مقال کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سبھوں کے دلِ عقیدت کے مُبھ سے چھلک رہے ہوتے۔ لوگ ان کے ہونٹوں سے پھوٹتیں حرف حرف کرنوں سے اپنی بطون کو اجالتے اور اپنی اپنی نگاہ میں مولانا کا قد اور رُتبہ بڑھاتے چلے جاتے۔

پھر یوں ہوا کہ قامت اور مراتب اس قدر عالی ہو گئے کہ یہ سب کچھ انھیں بھی سرور دینے لگا۔ مراقبے کی کیفیت طول کھینچنے لگی۔ ایسے میں ان کی خامشی اس قدر گمبھیر ہو جاتی کہ سناٹا بولنے لگتا اور ان کا اپنا کہا، ماالانسان لو لالسان، بھی جھوٹ لگنے لگتا۔ وہ جو بولتے ہیں اور بولتے چلے جاتے ہیں، اُن کی زبانیں تو ان خاک پُتلوں کو منہ کے بل گرا کر پیوند خاک کر دیتی ہیں مگر یہ جو چُپ ہے، بولتے سناٹے میں لُبی چُپ اور یہ جو مراقبہ ہے، کیف کی جھمر جھمر میں طویل مراقبہ، یہی تو سارے میں تقدس کی زبان کا رس گھولتا ہے۔ ایسا رس، جو قطرہ قطرہ دل کی ساعتوں پر ٹپکتا ہے ٹپکتا ہے اور ٹپکے جاتا ہے، حتیٰ کہ سب مسحور ہو جاتے ہیں۔

لاریب کہ نہال لمحوں کی اطالت میں بلا کا کیف اور غضب کی مستی تھی، مگر مولانا ملالوی کے بدن بیچ پڑا جنت دوزخ کا سوال بھی تو برف سِل ایسا نہ تھا کہ طویل مراقبوں کی حدت سے گھل کر خود بخود پانی ہو جاتا۔ یہ سوال تو لوہے کی سلاخ کی طرح روح کے عین وسط

www.urduchannel.in

میں پیوست تھا......اور جہاں یہ پیوست تھا، ٹھیک وہیں سے ناقابل برداشت درد کی ٹیسیں چل جاتیں تو وہ بے بس ہو جاتے۔ یہی بے بسی مراقبے کا مزا کرکرا کر دیتی تھی......لہٰذا کسی اور حیلے کی بابت تفکر فرمانے لگے۔

تقویم کی ایسی ہی تسبیح کو رولتے رولتے ایک روز مطلوبہ حیلے کا دانہ اُن کے ہاتھ آن لگا۔ یہ حیلہ پہلے کا متبادل نہ تھا، باوصف آزمانے والا تھا۔ وہ جو مولانا کہا کرتے تھے کہ 'الحدید یفلح بالحدید'، بہ مثلہ انھوں نے اپنی روح میں پیوست لوہے کی سلاخ کو لوہے سے کاٹنے کے لیے اپنی حدید اللسان پر جنت دوزخ کے تذکرے کی کاٹ کو بڑھا دیا۔ اس کے لیے انھیں خاص اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ پہلے پہل وہ گاہے گاہے بیان فرمایا کرتے تھے، اب تین اوقات مخصوص ہو گئے تھے۔ فجر، ظہر اور عشاء کی نمازوں کے بعد مقتدی بیٹھے رہتے، مولانا ملالوی دوزانوں ہو کر پہلو اس قدر بدلتے کہ اقامت کہنے والے سے لے کر بائیں جانب بیٹھے آخری صف کے آخری مقتدی تک سب کو ان کے چہرے کا کچھ نہ کچھ حصہ جھلک دے جاتا۔ نگاہ اُٹھا کر دیکھے بغیر دھیمے مگر دلنشیں لحن میں بیانِ ملاحم عطا فرمانے لگتے۔

پہلے پہل مسجد مائی مصاحب بانو میں نماز جمعہ کا اہتمام نہ ہوتا تھا کہ جامع مسجد مدنی زیادہ دور نہ تھی۔ ملحق محلے کی دوسری طرف سب کو جانا پڑتا تھا۔ مولانا بھی جمعہ کے روز نماز کے لیے وہیں تشریف لے جاتے تھے کہ اُن کا عقیدہ تھا: صلوۃ الجمعہ کا ہر مسجد میں اہتمام ضروری نہ تھا، تاہم اب صورت حال مختلف ہو گئی تھی۔ نہ صرف جمعہ کی نماز کا اہتمام ہونے لگا، مولانا خطبہ بھی دینے لگے تھے۔

معمول کی نمازوں کے بعد روزانہ کا سہ گانہ بیان فلک پوش پہاڑوں پر پانیوں سے لدے اُن بادلوں جیسا تھا جو چپکے سے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور سارے بدن کو طراوت کے احساس سے بھر دیتے ہیں جب کہ جمعۃ المبارک کا خطبہ جل تھل کر دینے اور پوری طرح بھگو ڈالنے والی موسلا دھار بارش کا سا تھا جو پہلے پانیوں کو نچڑنے نہ دیتا تھا اور اوپر سے چھاجوں اور برسا دیتا۔ خطبے کے دوران نہایت سلیقے سے منتخب کردہ الفاظ ایک خاص دھج سے

اُن کے سینے سے اُبلتے اور نرخرے پر اُچھلنے کے بعد ہونٹوں سے یوں ادا ہوتے کہ پورے ہال میں گونج بھر جاتی۔

مسجد مائی مصاحب بانو کا ہال بڑا نہ تھا۔ عذاب ثواب کے عظیم تذکرے پر تو یہ اور بھی چھوٹا پڑ جاتا۔ اوّل اوّل ان کے لحن میں غضب کی مٹھاس ہوتی ... یوں لگتا، جیسے اِدھر اُدھر شیرینی کے چھینٹے اُڑ رہے ہوں۔ جنت کے تذکرے کے بیچ دودھ اور شہد کی رواں نہروں انواع و اقسام کے میوہ جات، شرابِ طہور اور خوب صورت آنکھوں والی انکھیلیاں کرتی حوروں کی خوب دلنشیں آواز میں تصویر کشی فرماتے، یوں کہ جنت کی اس تصویر سے وابستہ تخیل پھیلتا پھیلتا اس قدر وسعت پا لیتا کہ جنت کے آٹھوں درجات آنکھوں کے سامنے کھلتے چلے جاتے اور صاف صاف دِکھنے لگتا کہ یہ دَارُ الخُلد ہے، وہ دَارُ المقام، اِدھر دَارالسلام، جنت عدن اور دارالقرار واقع ہیں اُدھر جنت نعیم، الماویٰ اور فردوسِ بریں۔ جب مولانا بتاتے کہ سات درجے تو انسانوں کی قیام گاہیں ہیں اور آٹھویں پر دیدار مطلق ہوگا تو سبھوں کے تصور کی نگاہیں جلال کبریائی کے نور سے جگمگ جگمگ کر اُٹھتیں۔ مولانا سورۃ الرحمٰن کی تلاوت، ترجمہ اور تفسیر فرما رہے ہوتے تو عجب استغراق کا عالم ہو جاتا۔ ایسے میں انھیں سننے اور دیکھنے والے مسحور ہو کر پکار اُٹھتے، احسن الاشیاء کلام صحیح من لسان فصیح من وجہ صبیح۔

جب مولانا دوزخ کے طبقات ستہ کی طرف ہمیائی بیان کا رُخ موڑتے تو جہنم، سعیر، حطمہ، لظیٰ، سقر، جحیم اور ہاویہ کا ایندھن بننے والوں کی نشانیاں کھول کھول کر بتاتے۔ پھر جب دوزخ کے لیے النار اور نرک جیسے مترادفات بدل بدل کر استعمال کرنے لگتے تو زبان بھی شعلہ بار ہو جاتی۔ لگتا کہ دہکتی آگ ہے جو سینوں کی سمت اُٹھتی ہے اور بدن کو یوں جلائے دیتی ہے کہ ہڈیوں کی چیخ تک سنائی دینے لگتی ہے۔ خصوصاً جب وہ سورۃ الاعراف کی چالیسویں آیت تلاوت فرما رہے ہوتے اور اُن لوگوں کی نشاندھی کرتے جن پر آسمان کے دروازے ہرگز ہرگز نہ کھولے جائیں گے تو یوں محسوس ہوتا جیسے مسجد کی چھت مقفل دروازوں والا آسمان بن کر سب کے سروں پر جُھک آیا ہے۔ مولانا تعجیلی اور تصریحی اسلوب میں مردود ٹھہرائے جانے والوں کی

www.urduchannel.in

بابت بتاتے کہ اُن کا جنت میں داخلہ ایسے ہی ناممکن ہے جیسے سوئی کے ناکے سے اُونٹ کا گزرنا ...... اور یہ کہ، دوزخ ہی اُن کا اوڑھنا اور دوزخ ہی اُن کا بچھونا ہے۔

جب وہ سوئی کے ناکے سے اُونٹ کے گزرنے یا پھر اوڑھنے بچھونے کی بابت بتاتے تھے تو ان کے وجود میں کہیں نہ کہیں ایک چُبھن سی ہوتی تھی تاہم اس چُبھن کا احساس اپنے ہونے کے باوصف یوں کافور ہو جاتا تھا جیسے اپنے محور پر پلٹیں ڈالتا کبوتر رفتہ رفتہ اپنی پنجنی کی جھن کو قبول کر لیتا ہے اور اُسے اپنے معمول کے بیچ کہیں نابود کر دیتا ہے۔

مسجد کا صحن بھی کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ جہاں اُس کی وسعت ختم ہوتی تھی وہیں تین مکمل اور دو نصف محرابوں والا برآمدہ تھا، جس میں طہارت گاہ بھی تھی اور وضو خانہ بھی۔ محرابوں کے اُوپر نصب پھولدار جالیوں کے پیچھے خالی جگہوں کے اندر پھٹیوں کو جوڑ کر کابکیں بنا دی گئی تھیں، جن میں بسا دیئے جانے والے کبوتر سارا سارا دِن مسجد کی منڈیروں پر غٹ غوں، غٹ غوں کرتے، پہلو بچا کر اِدھر اُدھر ہو جاتی کبوتریوں کے گرد گھمن گھیریاں ڈالتے اور موقع پا کر بغبغاتے اُن پر سوار ہوتے یا پھر صحن میں ڈالا گیا چوگا چگنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں وہاں بیٹوں کی خشک یا چپکتی ننھی منی گولیاں، جو اکثر بہتی تا پھیلتی سفیدی اور سیاہی مائل لیس کے بیچ اُبھری اور جمی ہوئی ہوتیں جو اس امر کی نشاندھی کرتی تھیں کہ وہ جہاں چاہتے چلے جاتے تھے، اس لیے کہ وہ سب مولانا ملالوی کو اچھے لگتے تھے۔

انھیں کبوتر یوں اچھے لگتے تھے کہ وہ اُن کی مدد سے اپنے تصور کے پکھیرو کو ایک ہی اُڑان میں اس حویلی میں اُتار سکتے تھے جو بعد میں جل بھُن کر راکھ ہو گئی تھی۔ تاہم یاد کی بستی میں کچھ یوں بسی ہوئی تھی کہ جب وہ وہاں ہوتے تھے تو کہیں نہ ہوتے، بس وہاں ہی ہوتے، بالکل لوٹن کبوتر کی طرح جو فلک میں تارا ہو جانے کے بعد اوپر ہی کی فضا میں مست ہو جاتا ہے اور وہیں لوٹنیاں لیے جاتا ہے۔ مگر جوں ہی اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نیچے آ رہا ہے تو مکرّر اُڑان لیتا ہے اور پھر سے لوٹن بھرنے کو رُجھ جاتا ہے۔

اُجلے کبوتروں کے وسیلے سے جس حویلی سے اُن کے تخیل کا سلسلہ جڑتا تھا اُس کی

چھتوں کی منڈیروں اور سیڑھیوں کی ممٹیوں سے بندھی چھتریاں ہمہ وقت اصیل کبوتروں سے آباد رہتی تھیں جب کہ اُس کا آنگن پیالہ اماں جی کی محنتوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

اماں جی کو دھیان میں لانا اور انھیں ہی سوچے چلے جانا مولانا ملالوی کو اور بھی بھلا لگتا ہے۔ ایسے میں یوں ہوتا کہ ایک رس بھری آواز اُبھرتی اور ہر کہیں یوں پھیل جاتی جیسے چاروں طرف سینکڑوں کبوتروں کی پنجنیاں مدھر آواز میں چھن چھن کیے جاتی ہوں۔ اِس سرمدی آواز کا سلسلہ رُکتا نہ تھا' حتیٰ کہ پورے ماحول میں نور سا گھُل جاتا۔ اِس نور دھارے کے قلب سے اماں جی کا چہرہ اُبھرتا تھا جو پوری طرح واضح تو نہ ہوتا' تاہم ہونٹوں کی جنبش صاف صاف دِکھتی تھی۔

شفیق اماں جی کے نظیف چہرے پر تھرتھراتے مرطوب ہونٹوں کے اندر سے دودھ جیسے دانتوں کا لطیف اُجالا تب سارے میں بھر جاتا تھا جب وہ انھیں پیار سے بجی میاں کہہ کر پکارتی تھیں اور قریب آنے پر اپنی گود میں بھر لیتی تھیں۔ گود کی گداز گرمی سے انھیں اُلجھن سی ہونے لگتی تھی۔ ایک مرتبہ جب امی جی نے انھیں کسمسا کر گود سے نکلتے پایا تو کہا تھا' بجی میاں! لگتا ہے اَب تم خود کو بڑا بڑا سمجھنے لگے ہو اور بھولے جاتے ہو کہ کیسے دودھ کی دھاریں لینے کو مچل مچل یہاں گھسے آتے تھے۔

یہاں' کہتے ہوئے اماں جی نے اپنی اُنگلیوں کو اپنی گود کی سمت موڑ لیا تھا ..... مگر اُن کی نگہ سیدھی وہاں جا پڑی تھی جہاں سے کبھی دودھ کی دھاریں اُمنڈا کرتی تھیں۔ ننھے بجی میاں نے دیکھا تھا' وہاں قمیض پوری طرح گداز اور سانسوں سے بھر گئی تھی' اتنی کہ اوپر پھیلی اوڑھنی بھی انھیں سنبھال نہ پا رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نظر نہ جما سکے تھے' شرم سے چہرہ بھی جھک گیا تھا' حتیٰ کہ وہاں ٹھہرے رہنا اُن کے بس میں نہ رہا تھا لہٰذا انھوں نے وہاں سے کھسک کر آنگن پار کیا اور سیدھے ناغول میں جا بیٹھے تھے۔ تاہم وہاں یوں ہی اکیلے بیٹھے بیٹھے اُس وقت کا تصور باندھنے کو آنکھیں موند لی تھیں جب اُجلے دُودھ کی دھاریں اُن کے حلقوم میں اُترا کرتی تھیں لیکن تب انھیں شدید مایوسی ہوئی تھی جب وہ ایسا تصور جما لینے میں بُری طرح ناکام

www.urduchannel.in

ہو گئے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ ہر بار اماں جی کا چہرہ دوسری سمت گھوم جاتا' پورے بدن سمیت...... اور ان کی پیٹھ کے اُجلے پن اور مغلئی پھوڑے میں سے ایک اُن کی نگاہوں پر تن جاتا اور دوسرا چبھنے لگتا' بالکل ایسے جیسے سفید کبوتروں کی ڈار آنگن میں اُترنے پر بھلی لگتی ہے مگر اُن کے ساتھ ہی کوئی سُرمئی جنگلی کبوتر آجاتا تو اُلجھن ہونے لگتی تھی۔

مسجد کے برآمدے کی کابکوں میں مقیم کبوتر پچاس سے اُوپر ہی ہوں گے' مگر تھے سارے ہی سفید' مرمر جیسے۔ اِس کا خاص دھیان رکھا جاتا تھا کہ کسی اور رنگ نسل کا کوئی پر گھرا کبوتر اِن میں ملنے نہ پائے۔ یوں نہیں تھا کہ سُرخ' چپڑے' چینے' درباز ے' بمنے' شار کے' کل پرے' خاکی سرے' سیاہ پو نچھے' زاغے' لنگوٹ والے اور مکھی پرے اِن اُجلے مقدس کبوتروں سے کم معصوم دِکھتے تھے بلکہ یوں تھا کہ بے داغ سفیدی اور اُجلا پن اور وہ بھی دودھ جیسا مولانا ملالوی کو بہت مرغوب تھا۔

ہر رات سونے سے قبل دودھ بھی وہ رغبت سے نوش فرمایا کرتے تھے' آبخورے یا کانچ کے گلاس میں نہیں' چینی مٹی کے بڑے پیالے میں۔ شاید اِس لیے کہ یوں وہ اس کی زیادہ ہموار سطح کو دیکھ سکتے تھے۔ انھیں دودھ کو حلق میں اُتار لینے کی عجلت نہ ہوتی' سامنے رکھے اُسے دیر تک دیکھتے رہتے۔ جب پیالہ تھامتے تو دونوں ہاتھوں سے' بہت احتیاط کے ساتھ' جیسے انھیں اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ اُنگلیوں کی پوروں کو نرمی سے پیالے کی بیرونی چکنی سطح پر پھسلنے دیتے تھے' یوں کہ جیسے وہ دودھ کی سفیدی کا لمس جانچ رہے ہوں۔ پھر بے اختیار ہو کر پیالے کے کناروں پر ایسے ہونٹ رکھ دیتے جیسے دودھ پی نہ رہے ہوں اُس کے اُجلے پن کو بوسے دے رہے ہوں۔

جب وہ چینی مٹی کے پیالے کو سامنے رکھ کر اُس کے گول دہانے کی وسعت میں ٹھہرے دودھ کی ہموار سطح پر نظریں جمائے بیٹھے ہوتے تو تصور میں اماں جی کی شفاف پیٹھ آجاتی تھی جسے انھوں نے بس ایک ہی بار اور ایک ہی لمحے کو دیکھا تھا مگر اَب تک دیکھے جاتے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک روز جب اماں جی بخار میں' پھنک رہی تھیں' ابا جی زنان خانے میں

آئے اور اماں جی کی ہائے وائے سن کر ہنستے ہوئے مٹھار مٹھار کر کہنے لگے' تُنّی بیگم آخر کو مغلئی پھوڑا ہے' جب تک رہے گا اس کی تنتناہٹ میں طنطنہ تو ہوگا۔ پھر ایک پُڑیا اماں جی کے سرہانے رکھتے ہوئے کہا' حکیم شرف الدین شرف سے منگوایا ہے یہ سفوف' کہتے ہیں نسخہ تیر بہدف ہے۔ اسے سرسوں کے تیل میں آمیز کر کے اوپر لپوا لینا' ایک دفعہ منہ کھل گیا تو سمجھو چین آیا۔ ابا جی نے یہ کہہ کر اپنے اکلوتے بیٹے کی اور دیکھا' کہا: ٹھنم میاں' ماں کا دھیان رکھنا' اور باہر نکل گئے۔

ابا جی کی عادت تھی کہ جب وہ گھر میں ہوتے تو شوخی سے لفظ چبا چبا کر ادا کرتے تھے اور باہر احباب میں ہوتے تو لہجے میں تمکنت آجاتی۔ اُن کی یہ عادت بھی تھی کہ گھر میں کسی کو اُس کے اصل نام سے نہ پکارتے تھے' کوشش کرتے کہ نام کا پلیتھن نکل جائے۔ ایسا نہ ہو پاتا تو خود سے کوئی عجیب سا نام رکھ چھوڑتے تھے۔ اماں کا نام جمیلہ خاتون تھا جسے انھوں نے تُنّی بیگم بنا ڈالا تھا۔ باہر کے کام کاج کے واسطے کلیم الدین تھا' رنگ کا کالسٹ' لہٰذا نام اور رنگ کی مناسبت سے کلّو کہلایا۔ کلّو کی بیوی گھر بھر کا کام کرنے کو چاروں پہر بجھول پھرکی کی طرح گھومتی رہتی تھی' نام نجمہ ہوگا' تبھی تو سبھی نجو کہتے تھے' مگر ابا جی کے واسطے وہ نجھو تھی۔ اپنے بیٹے کو سراج الدین یا بچی میاں کہنا انھیں نہ بھایا' بیٹا ٹھنم ٹھنا تھا' گول مٹول' چنانچہ ٹھنم میاں کہہ کر پکارتے۔

جب ابا جی مٹھار مٹھار کر بات کرتے یا ناموں کا پلیتھن نکال رہے ہوتے تو اُن کے بیٹے کو شدید اُلجھن ہوتی۔ اُس روز بھی ہوئی تھی مگر دھیان مُغلئی پھوڑے میں اٹکا ہوا تھا۔ اماں جی سے اس بابت پوچھا تو شدید تکلیف کے باعث انھوں نے ڈھنگ سے جواب نہ دیا' بس اتنا کہا: جان کا روگ ہے یہ بھی۔ اور یہ جواب اُن کی تشفی کے لیے بہت ناکافی تھا۔ سارا دن بچی میاں اُلجھن میں رہے اور شام پڑے جب سارے کبوتر چھتریوں پر آ بیٹھے تو بے دھیانی میں ڈیوڑھی سے ہوتے' بڑے کمرے' جسے سب محل کہتے تھے' میں جا گھسے اور دیکھا کہ ماں جی کی قمیض پشت سے کندھوں تک اُٹھی ہوئی تھی اور صاف شفاف اُجلی جِلد یوں لشک رہی تھی کہ

www.urduchannel.in

سارا الشکارا آنکھوں میں بھر گیا۔ ماسی نجو بائیں بغل کے پاس اُٹھے بازو کے نیچے سے قدرے پُشت کی جانب پوری طرح جُھکی ایک گومڑ پر سُرمئی سا لیپ کیے جاتی تھی۔

بجی میاں کو لگا تھا وہاں سامنے اماں جی کی پیٹھ نہ تھی اُجلے سفید کبوتروں کی ڈار تھی۔ اور اُدھر بغل کے پاس مغلئی پھوڑا نہ تھا اسی اُجلی ڈار میں کوئی سُرمئی جنگلی کبوتر آ گیا تھا۔ اُن کا جی چاہتا تھا وہ آگے بڑھ کر جنگلی کبوتر کو اُڑا دیں' کچھ اس طرح چپکے سے کہ سارے اُجلے کبوتر یوں ہی اپنے دھیان میں رُجھے رہیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے لاج سے اُن کے کانوں کی لویں تک سرخ ہو گئی تھیں اور وہ وہاں سے کھسک کر ناغول میں جا بیٹھے تھے۔ وہیں دیر تک لُک چُھپ بیٹھے وہ مُغلئی پھوڑے کے کرب سے آنسو بہاتے رہے اور اُن آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کرتے رہے' حتیٰ کہ انھیں اماں جی کی پکار سنائی دی اور سارے میں پنچیاں جھن جھن کرنے لگی تھیں۔

وہ بھاگم بھاگ اماں جی تک پہنچے اور مطمئن ہوئے کہ وہ اَب سکون سے بستر پر دراز تھیں۔ ماسی نجو جا چکی تھی۔ وہ اماں جی کے سرہانے جا کھڑے ہوئے تو اُن کی نظر بیٹے کے اُجلے لباس کے بھیگے دامن پر پڑی جس پر اَب تازہ مٹی جم گئی تھی۔ انھوں نے بے چین ہو کر قمیض کا دامن یوں تھام لیا تھا جیسے یہ داغ نہ ہو اُن کی اپنی پشت کا مغلئی پھوڑا ہو۔

مولانا ملالوی کو اُجلا لباس بھلا لگتا تھا تاہم اس بات کا خاص دھیان رکھتے کہ وہ بے داغ رہے۔ اگر کہیں بھولے سے کوئی داغ لگ جاتا تو وہاں سے یوں جھاڑے جاتے جیسے سفید کبوتروں کی مست ڈار میں سے اکیلے جنگلی کبوتر کو اُڑا رہے ہوں۔

سفید اُجلا لباس اُن کے بدن پر جچتا بھی بہت تھا۔ قد مناسب درازی لیے ہوئے تھا۔ کمر سیدھی تھی۔ بھرے بھرے کندھوں کے وسط میں گردن یوں بلند ہوتی جیسے کبوتر چونک کر ٹھہرتا ہے اور سر اُٹھا لیتا ہے۔ بھورے مائل سیاہ خضاب میں رنگی داڑھی' قدرے بڑے مگر چہرے کی گولائی کی مناسبت سے سج جانے والے ہونٹ' اُٹھی ہوئی اور ذرا آگے کو جھکی ہوئی ناک' تازگی کا احساس دیتی صاف شفاف اور اُجلی جلد' سُرمہ لگی آنکھوں سے جھانکتی سفیدی میں سُرخ ڈورے اور نیلگوں ڈھیلے جن میں فلک جیسی وسعت اور سمندر جتنی گہرائی تھی۔ چوڑی اور

بے شکن پیشانی مقدر کی تختی جیسی' جو اپنے حصے کی عبارت مانگتی تھی۔ دراز بال' اتنے دراز کہ کنگھی کرنے پر کانوں کی لوؤں سے نیچے آ کر گردن کو چھونے اور بوسے دینے لگتے۔ عام دِنوں میں قریشئے سے بنی سفید ٹوپی پہنتے جس میں سے لپک کر نیچے آتی اور بل کھاتی زُلفیں اور بھی بھلی لگتی تھیں۔ جمعہ کی روز طلا دوز کلاہ پر کلف لگی اور ابرق جمی سفید نفیس ململ کی دستار کا اہتمام کرتے تھے۔ دستار کا شملہ دائیں کان کے عین اوپر سے گزرتے بیچ میں یوں اُڑسا لیا کرتے تھے کہ بلندی پا کر اور آگے پیچھے تن کر پنکھ سا بن جاتا جب کہ دوسرا لڑ گردن سے ہوتا دونوں کندھوں کے درمیان پُشت پر پھیل جاتا تھا۔ مولانا ملالوی کی اس وجاہت کی تخلیق کے لیے قدرت نے جتنا سلیقہ برتا تھا لگ بھگ اتنے ہی جتن خود انھیں بھی اسے سنوارنے اور سنبھال رکھنے کو کرنے پڑ رہے تھے کہ اُن کا ایمان تھا 'اللہ جمیل' و یحبُ الجمال'۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ مولانا فقط اپنے ایمان کے باعث خود کو سنوارنے اور سنبھالنے کے جتن کرتے تھے' کہ یہ ایمان تو بس سج دھج کا جواز بن گیا تھا' یوں جیسے دو محبت کرنے والے وجودوں کے بیچ سے بغیر کسی تمنا اور طلب کے ایک نیا وجود تخلیق پا جائے۔ حقیقت یہ تھی کہ اوّل اوّل ساری تگ و تاز اس سوال سے بچنے کی محض ایک ادائے ناز تھی جو ان کے بدن کی کھنکتی مٹی کے اندر گونج بھر رہا تھا۔ تاہم بعد ازاں ایسا دِکھنا اُنھیں اچھا لگنے لگا تھا حتیٰ کہ یہ سب کچھ اُن کی شخصیت اور معمول کا یوں حصہ بن گیا جیسے اس کے سوا وہ کچھ تھے ہی نہیں' جب کہ جو کچھ وہ تھے خود اپنی آنکھ پر بھی اُسے نہاں نہ کرنا چاہتے تھے کہ اُن کا یقین تھا 'عین لاتری قلب لایحزن' کہ جب آنکھ نہیں دیکھتی تو دِل بھی غم زدہ نہیں ہوتا۔

اُن دنوں کہ جب مولانا ملالوی بجی میاں اور تھمنم کہلاتے تھے اور اپنی اماں جی کی اُجلی پیٹھ دیکھنے کے بعد ناغول میں چُھپ کر دُودھ کی دھاروں کے حلقوم میں اُترنے کا تصور جمانے لگتے تھے' اُن کا دِل لایحزن کے ایمانی حیلے سے قطعاً آگاہ نہیں تھا کہ اُن دِنوں ایمان تسلیم کر لینے اور بلا حیل و حجت مان لینے کا نام تھا۔ اندھیرا اس لیے اندھیرا تھا کہ وہ اندھیرا تھا۔ اس کی منطق کیا ہے' اس کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں' اور یہ کیوں ہے' سب اضافی سوالات تھے۔

www.urduchannel.in

اضافیت اور نسبت والے اضافی نہیں' فالتو' فضول اور زائد والے اضافی ۔ بہ عینہٖ اُجالا اِس لیے اُجالا تھا کہ سبھی اُسے اُجالا کہتے آئے تھے ۔ انھیں تعلیم دی گئی تھی کہ وہ جو سب اپنے اپنے ایقان کے ساتھ کسی ایک بات کو متفق علیہ کہتے تھے' وہ اجماع کہلاتا ہے اور اُس پر اعتبار کرنا ایمان ہو جاتا ہے ۔ اُن دِنوں یہی ایمان دانش کی بنیاد ہو جایا کرتا تھا اور اُستادِ مکرم نے بھی یہی بتایا تھا' لو لہ الایمان فَبطلت الحکمتہ' یعنی اگر ایمان کالعدم ہوتا تو حکمت باطل ٹھہرتی ۔

ایمان کے نور کی وہ مستقیم کرن جس کے سامنے کوئی منشور رکھا ہوا نہیں تھا' تب تک کالعدم نہیں ہوا تھا' جب تک انھوں نے صرف ایک محرم' اُجلے مگر ممنوعہ بدن کی پیٹھ دیکھی تھی ۔ دوسرے محرم بدن کی اُجلی اور ممنوعہ پیٹھ پر نظر پڑنے سے پہلے اُنھیں بجھے ہوئے بے کیف اور یخ بستہ بدن کو مسلسل دیکھنا اور سہنا پڑا تھا.....اور غالباً یہی وہ عرصہ تھا جس کے اندر کہیں وہ کفیان لمحہ پڑتا تھا جب روح پر پڑی چونک کی کفنی پہلی بار سِسکی تھی ۔

اگرچہ بیش تر گمان گم راہ کرتے ہیں لیکن مولانا ملالوی کا غالب گمان یہی تھا کہ وہ کفیان لمحہ عین مین وہی تھا جب وہ قدِ آدم آئینوں کے درمیان جا کھڑے ہوئے تھے اور ایک ایک کر کے اپنے تمام بے داغ اور اُجلے پہناوے' جو ساری عمر اُن کے جُثّے پر قطیر کی طرح رہے تھے' چھیل اُتارنے پر خود کو اِس باعث مجبور پایا تھا کہ بہ چشمِ خود وہ داغ دیکھ سکیں جو راکھ جیسے وجود سے مسلسل جُڑنے کی وجہ سے اُن کے تن پر ہو سکتے تھے ۔ وہ داغ تو کہیں نہ تھے' بس ایک سرسبز و شاداب بدن تھا' اُجلا اور تر و تازہ' جو آئینوں کے اندر جگمگا رہا تھا اور اس کی جگ مگ آئینہ در آئینہ' عکس در عکس ہوتی چلی گئی تھی ۔

یوں مکمل صورت میں' پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک' ہر پہلو سے اور نظر بھر کر اُن گنت عکسوں کے بیچ وہ اپنے بدن کو پہلی بار دیکھ رہے تھے اور کچھ اِس طرح دیکھ رہے تھے کہ اُن کی نگاہیں مُستلذ ہو رہی تھیں ۔ خود کو بہ اَمرِ مجبوری' ٹکڑوں میں اور چند ساعتوں کے لیے دیکھنے میں وہ لطف کہاں' جو آنکھ بھر کر دیکھنے اور دیکھے چلے جانے میں تھا ۔

ملکِ فہیم ریاست کا عقدِ ثانی پڑھانے کے لیے دوسرے شہر میں اُنھیں اگلے روز

دوپہر تک ہوٹل میں ٹھہر جانا پڑا تھا ۔ یہ وہی ہوٹل تھا جس میں وہ گزشتہ شب بارات کے ساتھ پہنچے تھے اور ملحق واش روم میں قدِ آدم آئینوں کے سامنے کھڑے کھڑے اپنے اندر اُس مسک کو راہ دے بیٹھے تھے جس کی وجہ سے وہ راکھ جیسا وجود بلا قصد خود پر حرام کر بیٹھے تھے جس کا کوئی داغ اُن کے بدن پر نہیں تھا ۔

(کہانی کو جاری رہنا ہے)

××÷××

بِس کی پُڑیا

گدرائے بدن سے طمث بہنے کا تیسرا دورانیہ پڑنے تک بیگم نیلوفر فہیم نڈھال ہو چکی تھیں۔ یوں نہیں تھا کہ دُکھ کے وجود میں اُترنے اور بدن بیچ سے رطوبتوں کے بہنے کا زمانہ پہلی بار ایک ساتھ آیا تھا۔ یہ بھی بجا کہ مسلسل مگر میٹھے حزن ہی کے پانیوں سے اُن کے وجود کی مٹی گندھی ہوئی تھی مگر اُن دنوں ہو یہ رہا تھا کہ چیر پھاڑ ڈالنے والے اور اُدھیڑ کر رکھ دینے والے دُکھ سے وہ اس طور پہلی بار رُو برُو ہو رہی تھیں۔ ہر ماہ کے معین دنوں میں آنے اور بدن سے میل کشید کر کے اُسے نکھارنے والا دورانیہ، جہاں تک انھیں یاد پڑتا تھا، خال خال ہی بے قاعدہ ہوتا تھا وہ آتا تھا اور معمول کے دنوں کے بیچ لگ بھگ اپنے طے شدہ وقت پر گزر جاتا تھا۔ اُن کے لیے تو سال کے بارہ مہینوں کا ایک ایک دن مخصوص تال کی سواری کے جیسا ایسا تھا، پندرہ بتیس نہیں، اٹھارہ سے اکتیس ماتروں والا۔ ہر دن اُن کے مردنک اندام کو یوں چھو کر گزرتا تھا جیسے تِی نا تر کٹ دِھی نا دِھی دِھی ہو رہی ہو اور خیال کے حیات آور سُر جب مست کر دینے والی لے میں لہر در لہر رگوں کے اندر اُتر کر ان کی جلد اور جثے کو اُجالتے اور نکھارتے چلے جاتے ہوں۔

مگر نئے دُکھ کی پہلی رطوبت بہ عجلت آئی تھی۔

اور چپ پوری طرح زائل نہ ہو پائی تھی کہ شرائے بھرتے لہو کی دوسری اور

www.urduchannel.in

تیسری باڑھ اتر پڑی تھی یوں کہ ہر بار انھیں یقین سا ہونے لگتا تھا کہ اَب کے بدن تھوتھ میں بہنے کے واسطے ایک بوند بھی نہ بچی ہو گی۔

کچھ ایسی ہی بپت اُن کی آنکھوں پر پڑی تھی۔

تاہم ہوا یہ تھا کہ آنسوؤں کی طغیانی طمث کے پہلے ریلے کے چپ چپاہٹ میں ڈھلنے کے عرصے ہی میں گزر چکی تھی۔ اَب تو یوں تھا کہ وہاں دشتِ ویراں کی ریت اُڑتی تھی اور وہ سارا منظر نامہ جو اُن کے جسم کے بخت چمکنے سے اُس کے بخیے اُدھڑنے کے بیچ پڑتا تھا، کہیں نہ تھا جو تھا، وہ بدن کی سُن تھی، جو خلیے خلیے میں اُتر چکی تھی اور دماغ کی بن میں وہ خالی پَن تھا جو پکھاوج کی طرح بجے جاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ لمحہ ٹھہر سا گیا جس کی راگنی کے الاپ اور تالوں میں اُن کے واسطے کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ ایسے میں انھیں خواہش ہونے لگی کہ انت کا نیاس سُر وجود کی خالی ڈیوڑھی میں گونجنا چاہیئے کہ انھیں یاد آ گیا تھا، جب وہ ایمن میں ریاض کرتے کرتے بیر ہو جاتی تھیں تو اُجی جی گندھار چھیڑنے کا اشارہ دیتیں اور جو کہیں بھوپالی کا پھیرا ہوتا تو رکھب پر خاتے کو کہتیں کہ ایمن اور بھوپالی کے سُر نیاس تھے مگر وہ سُر جو اَب اُن کے بدن بیچ گونج رہا تھا، سنکیرن راگنیوں کے کچھ اس ڈھب سے تمام ہونے کا اعلان کر رہا تھا جیسے زندگی کے وہ سارے سُر جو لذت کے مسلسل پن سے شرابور تھے، پلک جھپکنے میں بے رَس ہو گئے تھے۔

اُجی جی نے بتایا تھا، سنکیرن راگنیاں انھیں کہتے ہیں جن میں تمام سُر تسلسل میں استعمال ہوتے ہیں۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا، قریب قریب سارے ہی سُر اپنی اپنی لذت اُن کے بدن کے اندر اُتارتے رہے تھے۔ اُجی جی نے یہ بھی بتایا تھا کہ بادی سُر راگنی میں قطعاً متروک ہوتا ہے کہ اسے چھیڑیں تو راگنی باطل ٹھہرتی ہے۔ انھوں نے مڑی گردن سیدھی کی، کُہنیوں کو نرم گداز گدیلے میں دھنس جانے دیا، ڈھیلے پڑے جسم کو اُوپر کی سمت گھسیٹا اور سمیٹا، ذرا سا پہلو بدلا، ہمت کی اور بیٹھ گئیں۔ سنگھار میز کے شفاف آئینے میں اُن کا کھنچتا بدن جھانکنے لگا جس کے بیچ سے زردی فوارا بنے اُبلے پڑتی تھی۔

www.urduchannel.in

اُنھیں لگا بیادی سُر تو لگ چکا تھا۔

دماغ سے تپک سی اُٹھی اور آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچ گئے۔

سوچا، تو کیا تن بس یہی کچھ ہوتا ہے، بے ہڈی کی لوتھ، چیتھڑا اور چھیچھڑا، جو پہلے پہل اپنے چھوڑنے والے کو چھچکارتا ہے اور پھر سارا جیون رَس اُس کے حلق میں اُنڈیل کر اُس کی انتڑیوں سے فضلے کی طرح خارج ہو جاتا ہے۔

بدن بیادی کی بابت جب انھوں نے یوں گمان کیا تھا تو دھیان میں اُجی جی پھر سے آ گئی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں، اپنے اپنے تن کو تنویر کرنا یا تنور کر لینا اپنے ہی بس میں ہوتا ہے مگر بدن کو اپنے دھیان کا دان دے کر اسے تنویر کرنا یوں اصل قرینہ بنتا ہے کہ بدن فاضل نہیں ہوتا فضل ہو جاتا ہے، نرا فضل۔

فضل، فاضل، فُضلہ اور تن، تنویر، تنور جیسے الفاظ ایک دوسرے میں معدوم ہونے لگے تو اُجی جی کے دھیان نے پھر سنبھالا دیا۔ اَب کے وہ اصرار کر رہی تھیں کہ طبلہ، پکھاوج، مردنگ، ڈھولک، تانپورہ، سارنگی اور ستار ہو یا دلربا اور بانسری سبھی ساز تن جیسے ہوتے ہیں۔ جس طرح انھیں سُر کرنے کو دھیان دینا پڑتا ہے گٹکے کو...... تنابوں کو...... پلّے اور آہنی تاروں کو...... کھونٹیوں اور چوبی تونبے کو...... اسی طرح تن کی درستی بھی دھیان مانگتی ہے...... کہ زندگی جو سُر، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت اور نکھاد کی طرح تن سے پھوٹتی ہے، اُس وقت تک پھوٹتی رہتی ہے جب تک یہ ساز درست ہوتا ہے۔

اُس نے نظر بھر کر آئینے سے جھانکتے تن کے طناز تناؤ کو دیکھا، کھونٹوں اور تنی طنابوں کو جانچا، طمث کے یوں بکچھٹ بہ جانے کے باعث اگرچہ وہ ہلدی سا ہو گیا تھا تاہم اب بھی اس کی آب پوری طرح نظروں میں یوں بھرتی تھی کہ ایک نشہ سا چھلک جاتا تھا۔ اُس نے گھنٹی کے لنگن کی طرح جھولتی ٹانگوں کو سکیڑ کر یوں اُٹھا لیا کہ گھٹنے جثے میں کُھب گئے۔ پھر دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں بائیں کی اُنگلیاں گھسیڑ کر بازوؤں سے حلقہ بنایا...... ایسے کہ پنڈلیاں اپنی پھڑکتی مچھلیوں سمیت بیچ میں پھنس گئیں اور بغلوں میں گُھسے چلے جانے والے گھٹنے اندر کو دب

گئے۔ اب جو سامنے دیکھا تو سُدھال کھونٹیوں سے بندھے تناؤ کی تاروں سے اُٹھتے سُر مزہ دینے لگے تھے مگر جوں ہی پُھوٹی نگاہ میں آئی، لتے کی چیپ جم کر چترا ہوئی اور ماس کاٹنے لگی...... اتنی شدت سے کہ سارا مزا کِر کِرا ہو گیا۔

بدن میں بھپک جھپاک کی جُھرجُھری دوڑی تو پاؤں پھر سے لنگن ہو گئے۔ اگلی ہی ساعت کو یہی لنگن مطراق بنی جا چکے لمحوں کے پیتل پلّو سے ٹھناک ٹھناک یوں ٹکرانے لگی تھی کہ کرکرا ہو کر راکھ ہوتے قُقنس مزے کی چونچ کے سارے سوراخوں میں من بھاؤ نے راگوں کی جوت جگا اُٹھی تھی۔

جو مٹے جوت بن کر جاگے، اُس عرصے میں پڑتے تھے جب وہ نہ تو ملک فہیم ریاست کی بیگم ہوئی تھیں اور نہ ہی ملک صاحب سے نیلوفر کا نام پایا تھا۔ تب وہ اُجی جی کی نِلو تھیں اور انھیں کے پاس رہتی تھیں...... پاس کیا دل میں رہتی تھیں۔ وہ لمحہ تو بہت بعد میں آیا تھا کہ اُجی جی کا چوبارہ...... اور...... اُن کا دل...... دونوں ایک ساتھ دھڑ دھائیں بولنے لگے تھے...... اور جب تک ایسا نہیں ہوا تھا وہ سات سُروں کی سنگیا سے آباد رہتا تھا۔

اُجی جی کہتی تھیں، سات زمینوں اور سات آسمانوں کی طرح سُر بھی سات ہی ہوتے ہیں مگر اُوپر والا سا، نی کے بعد لگا دینے سے آٹھواں سُر بدن میں روح کی طرح جاگ اُٹھتا ہے۔ یہی آٹھ سُر پلٹے میں آ کر ایک دائرہ بناتے ہیں، مکمل دائرہ...... سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی، سا سا، نی، دھا، پا، ما، گا، رے، سا۔ وہ سُر پلٹوں کی ادائیگی میں ہارمونیم کے سینے پر پڑا اور اُس کی سانسوں سے کھیلتا اپنا بائیاں ہاتھ اُٹھا کر اندر کی سمت دباتیں اور پھر ایک ادا سے اوپر اُٹھا کر درمیانی اُنگلی سے دائرہ بناتے ہوئے ہوا میں یوں اُچھال دیتیں کہ ساری کائنات اُس کے محیط میں آ کر لرزنے لگتی۔ ایسے میں اُن کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں کی پوروں تلے سات سروں میں سے آٹھواں اور پلٹوں میں سے زندگی کی لذت پلٹ پلٹ کر یوں برآمد ہوتی کہ سارے ماحول میں اس کی مدھ مہک رچ بس جاتی۔

اُجی جی کا بدن لوٹھا تھا اور کندھے گول۔ پیٹھ پیچھا، گات، پیٹ اور بکھیاں چربی

www.urduchannel.in

سے لدی ہوئی تھیں۔قد ناٹا رہ گیا تھا اور یوں لگتا تھا وہ بیٹھے بیٹھے وہیں پھیل گئی تھیں۔ بازو اور ٹانگیں تو جیسے مڈھوں پر ہی یکم ہو گئے تھے کہ اب پارے جھولتے تھے۔ رنگ ایسا کہ تیل تو کہیں یا کل جھواں۔نقش یوں کہ واجبی کہنے کو جی پکا کرنا پڑے۔ ناک کا بانسہ اوپر ہی سے پھرا ہوا تھا جو چپرے ہوئے نتھنوں کو دبائے اور پھیلائے رکھتا۔کلیجی رنگ کے بڑے تنگ اور باریک تار والی منی سی نتھنی ناک کے ٹیڑھ اور نتھنوں کے چپر کو مزید نمایاں کرتی تھی، یوں کہ دیکھنے والے کو اُلجھن سی ہونے لگتی تھی۔کلونسے ہونٹوں میں سے مسلسل چبائی جانے والی گلوریوں کی پیک اور سرخ ہوتے مُرکے ہوئے دانتوں کی کُھلی درزوں میں پھنسے سپاری کے جھانکتے ریزے بھی اُن کی شخصیت کا گویا حصہ تھے۔

امام پورہ کو بانٹنے اور کاٹنے والی اکلوتی سڑک کے داہنے ہاتھ رنگلی بازاری تھی، جس میں، کم نہ زیادہ، چوالیس دوکانیں اور بائیس چوبی زینے تھے ...... جتنے اُدھر اتنے ہی ادھر۔ دوکانیں دن کو کُھلتیں اور زینے رات بھر بانھیں کھلی رکھتے۔ کھلی دوکانوں کی بغلوں میں دِن بھر اُونگھتے زینے جب رات پڑتے ہی انگڑائی لے کر اُٹھتے تو سیدھے اُن بالکونی نما چھجوں سے انکھیلیاں کرنے لگتے تھے جو اُس وقت تک روشنی اور رنگوں میں نہانے لگتے تھے۔ بازاری قدرے تاریک تھی۔ دوکانیں بند ہو جانے کے بعد نیچے کا حصہ اور بھی بجھ سا جاتا۔ تاہم بازاری میں داخل ہوتے ہی بائیس میں سے اکیس چھجے یوں لگتے جیسے روشنی کے بقچے ہوا میں معلق ہو گئے ہوں۔ وہ چھجا جس پر الگ سے روشنی کا اہتمام نہ ہوتا تھا، اُجی جی کے چوبارے کا تھا جہاں انھوں نے نِلوہ اور سارے سُروں کو ایک ساتھ بسا رکھا تھا۔

نِلوہ کو وہ آٹھوں سُر کہتی تھیں۔ وہی آٹھواں سُر جو اوپر سے آ کر لگتا ہے اور پہلے سُروں کے پلٹنے سے دائرہ سا بناتا چلا جاتا ہے۔

جوں جوں دائرہ بنتا گیا، اُجی جی اپنی کائنات سمیت اُس میں محیط ہوتی گئیں۔ سُروں کے مدّوراحاطے میں پوری طرح رچ بس جانے والی اُن کی کُل کائنات تھی بھی کتنی ...... ماضی کے جھروکے میں سے بڑے خان صاحب شومت خان اور مائی جی پرج بائی جھانکتی تھیں۔ حال

میں سُر ہی سُر تھے جب کہ آنے والے نامعلوم لمحے نِلوہ کے بدن سے ہو کر گزرتے تھے۔

اُجی جی نِلوہ کو پاس بٹھا لیا کرتیں اور بڑے خان صاحب اور مائی جی کا ذکر چھیڑ دیتیں، کہتیں، دونوں حسبی نسبی گائیک تھے۔ خود کو خوش قسمت بتاتیں کہ ایسے گُنیوں کے ہاں جنم پایا اور تفصیل سے بتاتیں کہ مائی جی کے خاندان والے بارہ بنکوی تھے، سات پشتوں کے مرثیہ خواں لہٰذا اسی میراث کے سبب میراثی کہلواتے۔ اسی نسبت کا فیضان تھا کہ اُن کے ننہال نے ہر کہیں احترام پایا تھا۔

اُجی جی بتاتیں کہ مائی جی سوز و سلام پڑھتیں تو سب کے دِلوں پر رقت طاری ہو جاتی اور ہر ایک یوں رونے لگتا کہ گھگھی بندھ جاتی۔ اُن کا خیال تھا کربلا کے معصوموں کا دُکھ مائی جی کے اندر اُتر گیا تھا لہٰذا آخری سانس تک سوز و سلام سے رشتہ جوڑے رکھا۔

جب وہ بڑے خان صاحب کا تذکرہ لاتیں تو اور بھی پُر جوش ہو جایا کرتی تھیں۔ پاس دھرے اُگالدان کو منہ کی سیدھ میں لا کر بیچ میں پیک پچکاری مارتیں، پیچھی کلوں اندر زبان پھیر کر انھا کرتیں اور اُگل کر پان کی ڈبیا کی طرف متوجہ ہو جاتیں، مہوا پان کو اُس کے کرارے پن کے ساتھ شہادت کی اُنگلی اور انگوٹھے کی چٹکی سے اُٹھا، ہونٹوں میں دبا دیتیں جو اُسے منہ بیچ دھکا دیتے۔ جب بات آگے بڑھانے کو تیار ہو جاتیں تو اُبھری گات کچھ اور اُچھال کر فخر سے بتایا کرتیں کہ اُن کے خاندان میں ایک سے ایک بڑھ کر گُنی تھا۔ تاہم جو نرنجن فن بڑے خان صاحب کے بخت کا ستارہ بنا، سب اُس پر رشک کرتے تھے۔ سُر کے سچے، تال کے پکے اور بول کے میٹھے تھے۔ بڑھے ہوئے ریاض اور فن کے ساتھ سچی لگن نے انھیں سُر سمندر کا شناور بنا دیا تھا، اتنا کہ اُدھر تان بجتی ادھر راگ، راگنی بوجھ لیا کرتے کہ اوڈھو، کھاڈو ہے یا سمپورن۔ گیان گھر وپا گہرا۔ دھیان میلان پختہ۔ استھائی، انترا، آروہی، اوروہی سچی تُلی۔ راگ، راگنیاں، دادرے، ٹھمریاں، گیت، غزلیں غرض جو سناتے رچاؤ سے اور لگتا کہ وہ خود نہیں گاتے تھے اُن کے رسال گلے سے بھگوان گاتا تھا۔

نلوہ کو اُجی جی کی ان باتوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ بعض اوقات تو انھیں بار بار ایک

www.urduchannel.in

ہی تذکرہ سن کر کوفت ہونے لگتی تھی مگر جب ذرا سیانی ہوگئیں تو چہرے کی ناگواری دبا لینے اور ظاہر نہ ہونے دینے پر قادر ہوگئیں کہ وہ میٹھا حزن جس کے پانیوں سے اُن کے بدن کی مٹی گندھی ہوئی تھی اب سیدھا اُن کے دل پر ایک سوال کی دھار کی صورت پڑتا تھا کہ اگر کسی بھی مرد نے اُجی جی کے بدن کو نہیں چھوا تھا اور اُن کے گربھ استان کے مقدر میں تخلیق کی لعبت لذّت سے ناموس رہنا ہی لکھا تھا تو وہ اُن کی ماں جیسی کیسے ہوگئیں؟

ماں بے شک نہ تھیں، ہو بہو ماں جیسی تو تھیں، مگر کیسے ہوئیں؟ یہ وہ خود نہ جانتی تھیں۔ تاہم اُن کا خیال تھا کہ اُن کا دِل عین بعین مائی جی کے دِل جیسا تھا، سوز و گداز میں ڈوبا ہوا...... اور یہ گداز تب اُن کے اندر اُترنا شروع ہوا تھا جب مائی جی سوزخوانی کرتے کرتے مر گئی تھیں۔ اُن کے چل بسنے کے بعد، گھر کی چھت پر دست پاک اور سیاہ جھنڈا بندھا تھا، نہ کشت کی صحنک پھری تھی۔ ذوالجناح کے گزرنے پر عین دروازے کے باہر سبیل کا سجاؤ ہوا تھا، نہ علم پاک اور تعزیہ نکالا گیا تھا۔ خاص اہتمام سے ڈیوڑھی میں چاندنیاں بچھنا تُرت موقوف ہوگئی تھیں اور مجالسِ عزا برپا کرنے کی طرف کسی کا دھیان بھی نہ گیا تھا مگر پھر بھی یوں لگتا تھا کہ مائی جی اُس گھر میں تھیں، ہر کہیں تھیں اور رُلائے دیتی تھیں۔ ایسا کہتے ہوئے اُجی جی کی آواز تھرا جاتی، حلق میں کوا پھنسنے لگتا اور آنسو اُمنڈ کر چہرے کی سخت کھردری اور سیاہ جلد پر سے لڑھکنے لگتے تھے تاہم بڑے خان صاحب کے ذکر پر وہ پوری طرح سنبھلی رہتیں اور بتاتیں کہ طبلے پکھاوج کی سنگت کے بغیر گانا اُن کے نزدیک عیب تھا، کہا کرتے تھے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو، بگڑا گویا مرثیہ خواں، اور شاید یہی وجہ تھی کہ مائی جی کے مرنے کے بعد مرثیہ خوانی کی بساط پھر نہ بچھی تھی۔

جب اُجی جی یہاں تک پہنچتیں تو نِلوہ اپنی تمام حسیات کو سماعت بنا لیتیں اور اُس لمحے کا تذکرہ سننے کو سراپا منتظر ہو جاتیں جب وہ اُن کی زندگی کا حصہ بنی تھیں مگر خود اُجی جی کو ان لمحات کے تذکرے میں مزہ آتا تھا جب سُر اُن کی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ مزے لے لے کر بتاتیں کہ سوگ چالیسوں گزر جانے کے بعد جب گھر میں سونا پا سیندھ لگا کر بیٹھ گیا

تھا تو وہ مسلسل ڈیوڑھی میں بڑے خان صاحب کے گھٹنے سے لگ گئی تھیں۔ مرثیہ خوانی کے سبب گلا تو پہلے ہی سے اُٹھا ہوا، پکا ہوا اور رواں تھا لہٰذا بہت جلد راگ راگنیاں تک سک سے درست ادا کرنے کے قابل ہوگئیں حتیٰ کہ فن کے سمندروں کا وہ سارا پانی جو بڑے خان صاحب کے سینے میں بہتا تھا اُن کے اندر بھی بہنے لگا تھا مگر اُجی جی کا اپنا خیال یہ تھا کہ ابھی تک وہ اس فن کی گہرائی کو نہ پا سکی تھیں۔ انھیں اپنے تذکرے میں تعلّی قطعاً پسند نہ تھی، لہٰذا وقت گنتارے کے منکے تیزی سے چھوتی آگے بڑھتے چلی جاتیں یہاں تک کہ انا چیتی میں وہ اُن لمحوں کو انگیخت دینے لگتیں جو نلوہ کے دل پر دھار بن کر گرتے تھے، یوں کہ اس ٹیس پر وہ کچھ ایسے زور سے دھڑکتا تھا کہ سینے کے اندر کی اُتھل پتھل باہر گرنے لگتی اور انگیا کی چڑیا تک اُڑ جاتی تھی۔

جا چکے لمحوں کو یاد کرکے نلوہ کے سینے کی اتھل پتھل اَب بھی باہر گر رہی تھی مگر طمث کے زور کا تیسرا مہینا چترا بنے اُن کا ملائم ماس بے دردی سے کاٹ رہا تھا، لہٰذا یوں ہی سوچے چلے جانا ممکن نہ ہو پا رہا تھا۔ انھوں نے خیال غبار سے نکل کر آئینے میں جھانکا، انھیں لگا، بدن کی زردی خلیوں کے بیچ میں واپس گم ہو رہی تھی اور یقین کے ساتھ سوچا کہ ایسا اس لیے ممکن ہو پایا تھا کہ انھوں نے اُجی جی کے دھیان میں تن من کو اُلجھ جانے دیا تھا۔

یوں ہی کمر جفتہ کیے بیٹھے رہنے سے ریڑھ کی ہڈی کو ڈچی میں دُکھن ہونے لگی تھی۔ پوری طرح ہتھیلیاں کھول کر پہلوؤں کے ادھر اُدھر بستر پر جمالی، پُشت کو سیدھا کر کے نچلے دھڑ کو جھٹکا دیا اور کفل کمان کو آگے کھسکایا۔ لشکن بنے پاؤں فرش پر بچھے قالین کے ریشوں کو چھونے لگے تو تلووں پر یوں لگا جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔ قدموں پر بدن کا بوجھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو سن ہو چکے تھے، یوں جیسے کئی ماہ سے اُن کے اعصاب میں موجزن وہ چینک سن چلی آتی تھی جس میں اُجی جی اپنی یادوں سمیت بسا کرتی تھیں۔

اُن کی جس ڈھب سے پال پوس اور اُٹھان اُسار ہوئی تھی اُس میں گزرے وقت کے اڑیل گھوڑے کی پالہنگ کو یادداشت کی ہتھیلی سے یوں سرک کھسک جانے دینے کی گنجائش تو نہ نکلتی تھی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ تن سیتل ہو میت سوں اور من سیتل ہو میت سوں، تو اُن کے ساتھ

www.urduchannel.in

یہ ہوا تھا کہ راجہ گھر آئی جھٹ رانی کہلائی، نِلوہ نام پر لکیر پھری، بیگم نیلوفر فہیم کے نام کا ٹھپا لگا اور ساتھ میں عجب ٹھسا بھی لایا۔ کُھڈ جیسے چوبارے سے اتنے وسیع و عریض بنگلے میں اُترنے پر پہلے تو اس کی وسعت ہی اُن پر چڑھ دوڑی تھی۔ پھر بنگلے کی سج دھج ایسی کہ بولائے دیتی تھی اور ہولائے دیتی تھی کہ کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں۔ بار بار اپنے آپ کو چٹکیاں بھرتی تھیں، خود کو یقین دلاتی تھیں اور اپنی قسمت پر ناز کرتی تھیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ شبِ زفاف ملک صاحب نے وعدہ لے لیا، ماضی کو بھول جاؤ...... سونے کی تیز دھار کٹاری جو اُن کے ہاتھ لگی تھی کچھ ایسے کوندے چھوڑتی تھیں جو سید ھے دِل پر پڑے تھے لہٰذا یادداشت کی نرم تُچ پر جھٹ رکھ دی، جو کچر پچر کرتی پہلے ہی بلّے میں پرے جا پڑی تھی۔

کچھ ایسا ہی پیمان اُجی جی نے عین رخصت سے اپنی بھیگی آنکھوں اور گیلے ہونٹوں کے اصرار سے لینا چاہا تھا تو اُن کا دِل بے طرح بھر آیا تھا، اوپر کناروں تک ...... اور کہا تھا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟...... پھر جب دہلیز سے باہر پاؤں دھرتے سے اُجی جی کا بدن کٹے شجر کی طرح چٹاخ زمین پر آن پڑا تھا تو وہ پلٹ کر اُس سے لپٹ گئی تھیں۔ دُھک دُھکی میں دَم ہوگا کہ پلٹ لپٹ کے عرصے میں ہی نکل گیا تھا مگر وہ یوں بھلک بھلک روئے جاتی تھیں جیسے بے دَم وجود کے قدموں میں وہ خود بھی بے دَم ہو جائیں گی، ساتھ ساتھ تکرار کیے جاتی تھیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟؟... کیسے ہوسکتا ہے؟؟؟

مگر جو نہیں ہوسکتا تھا، وہ ہو گیا تھا۔

اور جو نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ بھی ہو رہا تھا۔

اُنھیں لگا جیسے وصل سمے کا وعدہ اور رخصت سمے کا اصرار چھل بٹا تھا، میٹھا فریب اور اپنے آپ سے دھوکا۔ ورنہ یہ تو وہ تانت ہے جو ٹوٹنے کے واسطے ہی تنتی ہے۔ ہونا اور نہ ہونا کسی کے بس میں ہوتا ہی کب ہے، ایسے ہی جیسے کچھ لمحے پہلے تک وہ خود اپنے بس وَس میں نہ تھیں اور بدن پھوگ فضلہ بنا تعفن چھوڑتا تھا۔ جب کہ اب یہ عالم تھا کہ طمث طیف سے نکلتی روشنیوں، رنگوں اور مہک نے عکس در عکس انھیں زنجیر کر رکھا تھا...... اور جب انھوں نے انگلیوں بیچ انگلیاں

پھنسا کر اُن میں سوئی پڑی چیخ کو سر کے اوپر اُچھالنے کو بازو اُٹھائے تھے تو پاؤں کے تلووں تک کی سن بھی بدن زنجیر کی ہر کڑی کے ساتھ چھنک چھوں بول اُٹھی تھی۔

اس چھنک چھوں کی لپک ایسی تھی کہ ساری کی ساری نظر چوکنے میں نہ آتی تھی۔ وہ پورے قد کے ساتھ ستواں کھڑی تھیں۔ اوپر اُٹھے خوابیدہ چیخ کو جگاتے اور اُچھالتے بازو کہنیوں سے غائب ہو گئے تھے۔ تن کا طلسم کُشا کرتے آئینے کے حاشیے کی نچلی لر میں گھٹنوں تلے سے بھی وہ گم ہو گئی تھیں۔ اس کے باوجود جتنی وہ نظر آتی تھیں اُس پر نظر پار اٹھہرتا نہ تھا حتیٰ کہ اس کے سلک تن کے کھلتے تھان سے پھسلتی کنواری آنکھیں سمور بنی بغلوں میں اُلجھ گئیں۔ نرم، ریشم رواں سے بالوں نے اپنی کنڈلیاں پوری طرح بنا سنوار لی تھیں۔ یہ غالباً پہلی بار اس قدر بڑھے تھے کہ بل دار ہو گئے تھے یا پھر شاید پہلی بار یوں ہوا تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں مخمور بھی کرتے تھے اور اُلجھن میں بھی ڈالتے تھے۔ اسی جھونج مخمصے کی فضا میں اُوپر اُٹھے بازو ڈول کر تیزی سے نیچے آئے تھے اور دائیں کی ہتھیلی بائیں اور بائیں کی ہتھیلی دائیں بغل کی کُنڈ میں دب کر نرم نرم گچھوں کو یوں سہلانے لگی تھی جیسے ان کا ہر ریشہ وہاں اپنے اپنے کنڈل میں منہ موڑے تب چھپے رہنے سے دُکھنے لگا ہو۔

ہتھیلیوں کے پیالوں نے دُکھن کا سارا پانی بھر لیا تو انگلیوں کی پوروں کی پیاس جاگ اُٹھی تھی۔ ابھی وہ پوری طرح سیراب نہ ہو پائی تھیں کہ اُجی جی پھر سے یاد آگئیں۔ اُجی جی کو یوں اپنی مرضی اور سہولت سے یاد کرنا، وقفے دے دے کر، زندگی کی لگی بندھی ترتیب سے نہیں، کبھی ادھر سے کبھی اُدھر سے، انھیں اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ اُن کے بے دَم وجود پر رودھو، سنبھل چکی تھیں جب کہ اب جو یاد کیا تو یوں لگا، جیسے زندگی کی سانسوں کی طرح، پورے ماحول میں ہمکنے کو یوں چلے آتی تھیں جیسے وہ اُجی جی نہ ہوں بارہ کے بارہ کومل اور شدھ سُروں والی بھیرویں راگنی کی ٹھمری ہوں جو سُر، شرتیوں اور حرکتوں کی نازک ادائیگیوں کے لیے نوری گلا مانگتی ہے۔

جا میں تو سے ناہیں بولوں، بولوں کی لنگروا

www.urduchannel.in

انھیں یوں لگا جیسے اُجی جی سچ مچ کمرے میں آ گئی تھیں، اپنی مہک کے ساتھ، اپنی سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ، اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ ...... اور ...... اپنے نوری گلے کے ساتھ۔

اپنی گرج کو ڈھیٹ لنگروا، جا میں تو سے ناہیں

اپنی گرج سپتک کے رسیا تن میں جب سارے شدھ اور کومل سُر ٹھٹھک کر ٹھہر گئے، سوائے دھیان دھیوت کے، جو جھینپ بن کر رگ رگ میں دوڑنے لگا تھا، تو لمس کی لنگر وا قفلی کھٹاک سے کھُل گئی تھی۔

وہ دراز کھولے چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے لگیں۔ اعلیٰ درجے کا فوری اثر والا سفوف بھی دسترس میں تھا اور بڑھیا نسل کی، لمحوں میں بال گالنے اور صفاچٹ کرنے والی ملہم بھی ...... مگر انھیں گندہ بیروزہ چاہیے تھا کہ بالوں کے اوپر لیپ کر انتظار میں بیٹھ رہنے سے انھیں بھلا یہ لگتا تھا کہ چٹکی میں اس کی لیس بھر لیں اور تھوڑے تھوڑے بالوں کی گچھیا بنا کر اُس میں چپکائیں اور جڑ سے اُکھاڑتی چلی جائیں۔ اُن کا خیال تھا انتظار کا روگ سفوف اور ملہم کی ناگوار بُو کو ناقابل برداشت بنا دیتا ہے جب کہ چٹکی کی چپک کی مدد سے بالوں سے آنکھ مچولی گندے بیروزے کی مہک کو سانسوں میں بسا دیتی ہے۔

جب پانی کی نیم گرم پھوار میں تادیر کھڑے رہ کر نُچے بالوں تلے کا ماس مساس کیا تھا یا پھر ایڑھیوں کی چپک چکٹ کو کھر سیلے سے رگڑا تھا، صابن مل مل کر جھاگ بنایا تھا یا تن کو تولیے سے دبا دبا کر صاف کیا تھا۔ انگیا کی کٹوریاں گداز سے پوری طرح بھر دی تھیں یا اُس کی ڈوریاں کس کس کر باندھی تھیں۔ چولی چڑھائی تھی یا ساڑھی کو پوشاک کیا تھا۔ بال سنوارے تھے یا مسی کاجل کیا تھا۔ ہر ہر مرحلے پر انھیں یوں لگا تھا جیسے ساڑھ ستی کا اثر اُن کے بدن پر سے ٹلے جاتا تھا اور جب زُحل کا عمل پوری طرح گزر چکا تھا تو وہ اُجلی ہو کر یوں قیامت ڈھاتی تھیں کہ آئینہ تڑختا تھا۔

خود سنبھل سنور گئیں تو خواب گاہ کا بکھراؤ کھلنے لگا تھا۔ گذشتہ تین ماہ سے بھی زائد

عرصے میں انھوں نے اپنی خدمت پر مامور فضیلت جان کو زیادہ دیر اندر ٹھہرنے نہ دیا تھا کہ وہ اسے ڈھنگ سے درست کر دیتی۔ یوں ہی چت پڑے رہتا، گم صم، خوابوں اور خیالوں کے طویل وقفوں میں، بولے گئے اور بولے جانے کو منتظر لفظوں کے بیچ خلا جیسی وسعت میں، اُنہیں اچھا لگتا رہا تھا مگر اَب نہیں اور وہ چاہتی تھیں کہ سب کچھ جھٹ سے ایک خاص ترتیب پا جائے، یوں جیسے وہ خود منظم ہو چکی تھیں۔

انھوں نے دروازے کی سمت دیکھا، فضیلت جان کے فوری آنے کے امکان کو وہاں خاموشی کی مکڑی کے جالے نے خود میں اُلجھا رکھا تھا۔ اپنے بستر پر پڑی اُس نازک سی گھنٹی کی سمت نگاہ کی جس کی مَنّی سی ٹنکن چپتل پلّو کو چھو کر پوری طرح ٹن نہ کر پاتی تھی کہ فضیلت یوں دوڑے آتی تھی جیسے وہ کان لگائے رکھنے، گھنٹی کی آواز سننے اور دوڑ کر پہنچ جانے کے واسطے ہی ملک صاحب نے مامور کی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے گھنٹی کو اُٹھا ہاتھ روک لیا کہ بستر کے بکھراؤ سے زیادہ اُس کے کچے ذائقے والی بجھیل اُمس اُن کے دِل کو کچیانے لگی تھی۔ کمر سیدھی کی، پلٹیں، دروازے کی سمت بڑھیں اور خواب گاہ سے باہر نکل گئیں۔

جب وہ شہ نشین سے ہوتی، جچے تلے قدم اُٹھاتے خم و چم سے نشست گاہ میں پہنچیں تب کہیں جا کر فضیلت جان کی نظر اُن پر پڑی تھی۔ وہ پہلے تو ٹک ٹک دیدم دَم نہ کشیدم انھیں دیکھے جاتی تھی اور پھر اُسے ایسا لگا تھا کہ جیسے مدت مدید سے کسارتا سارا بنگلہ انگڑائی لے کر پوری طرح یوں جاگ اُٹھا تھا کہ سارے میں کھِنڈتا اُجالا کھنکنے لگا تھا۔

گزرے وقتوں میں جب کہیں وہ اس طرح تراش خراش نکالے اُجی جی کے سامنے آتی تھیں تو بھی ماحول مہک لہک اُٹھا کرتا تھا اور اُجی جی اُمنڈتی خوش بو سے یوں بشاش ہو جاتیں کہ دھیان اِدھر اُدھر ہو جاتا، سارے رواں سُر بہکنے لگتے تھے۔ کانہڑے کا دھیوت کومل نہ رہتا شدھ ہو جاتا جس سے راگنی اپنی جون بدل کر شاہانہ ہو جاتی، گوجری ٹوڈی میں پنچم بے درنگ لگنے لگتا، گونڈ سارنگ کی آروہ میں نکھاد برجت سے وِکر ہو جاتا یا پھر سمجھ ہی نہ آتا تھا کہ اُجی جی جو راگنی چھیڑے ہوئے ہیں وہ شدھ سارنگ ہے، بندرابنی سارنگ ہے یا شاہ

www.urduchannel.in

کلیان۔حتیٰ کہ سارے ساز چُپ ہو جاتے، وہ بلائیں لینے کو دونوں ہاتھ کنپٹیوں کے قریب لاکر ہتھیلیوں کو کلائی کے محور پر گھماتیں اور اُن کی سمت اُچھال کر یہ بول گنگناتے چلی جاتیں:

تُم ہی تارن جگ نستارن تم بن کون کھویا

بِلوہ کے لیے اُجی جی کی آنکھوں میں سدا تشکر کی لہر بہر رہی کہ وہ اپنے بدن کو پاتال جنتر اوران کے تنِ رخشندہ کو اپنی روح کے لیے کشتۂ کندن جانتی تھیں ...... مگر تب اُن کی آنکھیں خدا کا قہر برسانے لگتیں جب رنگلی بازاری کے بائیس میں سے اکیس روشن بقچوں کی سوختنوں میں سے کوئی سُر سودھن کے لیے متعین اوقات میں اُن کے چوبارے بن سنور کر آجاتی تھی۔ اپنے فن فاخرہ کو لُٹانے کے لیے ہر وقت طبیعت کو طبلۂ عطار بنائے رکھنے والی اُجی جی جب بھڑک اُٹھتی تھیں تو زبان کا ٹانکا ٹوٹ جاتا تھا۔سارے سُر سبق بھول بھال جاتیں حتیٰ کہ سامنے مؤدب سمٹی سہمی دوزانو بیٹھنے والیاں بھی آنکھ اوجھل ہو جاتیں اور ہر ایک کی بائی کو بے نقط سنائے چلی جاتیں۔نوشابہ بائی اُن کی نظر میں اختی گھوڑی تھی اور ستارہ خام پارہ، شاداں بائی اُچھال چھکا تھی اور جو ہی کسبن، کوئی حرافہ خایہ بوس تھی تو کوئی بڑھیل کوا پری اور کوئی نائیکہ جھل بجھانی خسے سیلانی، جو اپنے اپنے کان چھدوانے اور اپنے اپنے کھٹلے میں مُرکی ڈلوانے کی حرص میں بےچاریوں کی ہر آڑ توڑنے کو بھیڑوں کی طرح ریلنے رولنے میں لگی ہوئی تھیں۔

اُجی جی جب خوب جھال پھین جھاڑ چکتیں تو اپنے چربیلے پیٹ میں انگلی چبھو کر کہتیں، یہ سارا دھندا تختۂ بلور کا ہے پگلیو، مگر تم کیا جانو...... پھر ہتھیلی پوری طرح کھول کر اپنی تھلتھلاتی گات پر مارتیں، ایسے کہ تھاپ پڑے کی گونج سارے میں سنسنانے لگتی تھی۔اسی اثناء میں اُن کی آنکھیں جَل تھَل ہو چکی ہوتیں اور ہونٹ سرگوشیاں اُنڈیلنے لگتے، بھاڑ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔یہاں تک کہ نیامِ چشم سکیڑنے کو جی چاہنے لگتا۔آنکھیں بھچنے سے سارے آنسو دو دھار میں گالوں کو نابدار بنا کر بہ جاتے۔ساتھ ہی ساتھ اُن کے اندر موجزن سارا غصہ بھی کسی نابدان کی راہ لیتا تھا۔

پھر جو آنکھیں کھولتیں تو بالکل مختلف اُجی جی ہوتیں ...... وہی ...... جو حقیقت میں وہ

تھیں، شفیق، سیتل، متین، شُستہ اور شائستہ۔ پہلے تو وہ اُن سب کو جو سہمی بیٹھی ہوتیں چھدّے مدّے کہہ کر پیار کرتیں اور وضاحت کرتیں: ''اڑیو مجھے تم سے کوئی بیر نہیں ہے کہ تم تو خود جلے بخت کے پھیرے میں ہو،،۔ پھر بلوہ کے سر پر ہاتھ رکھتیں اور بتاتیں کہ: ''ان کا مقدر بھی تمھارے بخت سے مختلف نہ ہوتا اگر یہ ان بےخصمی چیچڑیوں کے ہاتھ لگ جاتیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بڑے خان صاحب نے انھیں میری گود میں ڈال دیا۔''

بڑے خان صاحب کے تذکرے کو وہ جان بوجھ کر طول دیا کرتی تھیں۔موقع بےموقع تفصیل سے بتاتیں کہ کیسے اُنھوں نے زندگی کی للک اُن کے تن میں بھر دی تھی، کس طرح پال پوس کر جوان کیا اور سُر سنگھار سے آراستہ کیا تھا اور کیسے وہ اُن کی ڈھلتی عمر پر کُڑھا کرتے تھے۔ پھر وہ اُس وقت کا قصہ لے بیٹھتیں جب گلی گلی سے فساد پھوٹ بہا تھا۔لاشیں گرنے لگی تھیں اور موسیقی بھی فرقوں میں بٹ گئی تھی حتیٰ کہ ایسی لکیر پڑی تھی کہ سب کچھ تقسیم ہو گیا تھا۔اُس طرف سے ادھر آنے کا ماجرا مہاجر کیمپ میں مقیم ہونے تک لا چکتیں تو یوں ہونکنے لگتیں جیسے یہ ساری کُلفت اُنھوں نے ابھی ابھی اُٹھائی تھی۔

جب سانس برابر کر چکتیں تو یہ کہنے کے لیے حیرت کو پوری طرح چہرے پر پھیل جانے دیتیں کہ ایک کنواری، ڈھلتی عمر کی عورت کی گود میں ممتا کہاں ہوتی ہے...... مگر جانے اُن کا وہ کون سا عمل تھا جو اوپر والے کو پسند آ گیا تھا اور بڑے خان صاحب اور مائی جی کے صدقے اُن کی گود ممتا کے نور سے بھر دی تھی۔ پھر اپنے گرد جواں جسموں اور چمکتی جلد والی کنواریوں پر پھسلتی نگاہ ڈال کر بات آگے بڑھاتیں کہ، ایک اُدھیڑ عمر عورت، جسے اپنے بےڈھبے بدن کی رائیگانی کا روگ اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح چاٹے جاتا ہو اور جسے حتمی یقین ہو چکا ہو کہ اُس کا جسم کسی مرد کے لمس کے واسطے ہرگز ہرگز نہیں بنایا گیا تھا، اُس کی گود میں ممتا جیسے لطیف جذبے کی تلاش، چیل کے گھونسلے میں ماس کی تلاش کے مترادف تھی...... مگر بڑے خان صاحب باکمال گُنی تھے، ٹوٹے ساز کی تاروں سے بھی ٹھیک ٹھیک سُر نکال لانے پر پورا پورا ملکہ رکھتے تھے۔ انھیں یقین تھا، وہ اُن کے بدن سے بھی زندگی کے سُر نکال لائیں گے۔مگر اُن کا

www.urduchannel.in

بس نہ چل رہا تھا، موقع ہاتھ نہ آتا تھا لہٰذا سب کچھ دیکھتے تھے، کڑھتے تھے اور اندر ہی اندر من پر قابو پانے کو گنگناتے رہتے تھے ..... 'روٹھی رُت نہ مانی، عمریا بیتی جائے، حتیٰ کہ ایک ننھی سی بچی کی آیا اُسے اکیلے روتا چھوڑ کر کیمپ ہی میں مرگئی..... یوں کہ جیسے وہ اُدھر سے اس طرف اس بچی کو پہنچانے اور مر جانے کے واسطے ہی لمبی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ بڑے خان صاحب کو تو جیسے موقع ہاتھ لگا تھا .... وہی جس کی وہ تا ہنگ تاک میں تھے، پھول جیسی بچی کو اُٹھایا، اُس کے چمکتے گالوں پر باری باری بوسے دیئے اور اپنی بیٹی کی بوڑھی گود میں ڈال دیا۔ اُجی جی بتایا کرتی تھیں کہ بچی گود میں کیا آئی ممتا کے سارے سُر اُن کے اندر سے پھوٹ بہے، اس طرح کہ وہ خود بھی نہال ہوگئی تھیں۔

اگرچہ اُجی جی نے یہ بھی بتایا تھا کہ مرنے والی، بچی کے ساتھ اپنے رشتے کی وضاحت کیے بنا دم توڑ گئی تھی مگر نلوہ کے من میں ایک پھانس تھی، سو وہ کُرید کُرید کر ناک نقشہ پوچھتیں، ایک تصور جماتیں اور اس تصور کے آئینے میں خود کو دیکھتیں۔ وہ کُریدے چلے جاتیں تا اینکہ اُجی جی زچ ہو کر کہہ اُٹھتیں ' بھلا اُس کل مکّھی کا میری نلوہ سے کیا رشتہ ہو سکتا تھا، حد سے حد یہی نا جو ہم دونوں کے بیچ ہے ... م ... مگر ایسا بھی کہاں جو ہم دونوں کے بیچ ہے ویسا تو کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔ نلوہ اس جواب پر مطمئن تو نہ ہوتیں مگر کچھ نہ کہہ سکتی تھیں کہ کتنی دب جاتی تھی۔

اس کے بعد کے قصے میں اُجی جی کا اپنا بدن راگ دیپک کی طرح متروک ہو جاتا ہے کہ جس آگ نے بھڑکنا تھا بھڑک چکی تھی اور جس چراغ کو جلنا تھا، روشن ہو چکا تھا۔ یہی اُجی جی کی زندگی تھی اور یہی اُن کی زندگی کا قصہ تھا جسے وہ دہرایا کرتیں اور لطف اندوز ہوا کرتیں..... اور جسے سن کو روشن بقچیوں والیاں اس لیے مجبور تھیں کہ ہر ایک کی بائی کو اُن کے جواں بدنوں کے لیے کچے پکے سُروں کا تانا بانا چاہیے تھا۔ جب کہ اُجی جی تو سُر کا سمندر تھیں جو بھی، چاہے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی، اُن کی صحبت میں آتا تھا، بھیگ بھیگ جاتا تھا۔

جس روز اسی سُر سمندر اور انہی محبتوں کی بارشوں سے بھیگا بدن پورے قد کے ساتھ

نشست گاہ کے وسط میں ایستادہ ہو گیا تھا اور سارا جھینجتا بنگلہ جھجھا اُٹھا تھا اُسی روز دوسرے شہر میں مولانا سراج الدین سحور ملالوی، ملک فہم ریاست کا عقدِ ثانی پڑھا رہے تھے۔ خادمہ فضیلت جان حیرت سے مالکہ کو دیکھے جاتی تھی۔

جب اُن کا تَن بَاسی تباسی بستر پر بے سُدھ پڑا تھا تب بھی کچھ کم قیامت نہ ڈھاتا تھا مگر اَب جو آئینہ تاب نہ لاتا تھا تو اس لیے کہ آب قطروں سے دھل کر وہ غضب کا آبدار ہو گیا تھا، یوں کہ بنارسی ساڑھی کے بَل بَل سے بدن بقعہ باہر چھلکتا تھا۔

فضیلت جان کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ عین اُس روز کہ جب ملک صاحب اُن کی سوکن لانے کا بندوبست کر رہے تھے وہ یوں بن سنور کر باہر کیوں نکل آئی تھیں ..... اور ..... اگر یوں ہی سجنا سنورنا تھا تو وہ کیا تھا جو تین ماہ سے بھی زیادہ خواب گاہ میں مقید رہ کر اور بستر سے لگ کر گزار دیئے تھے وہ سوچتی رہی اور اُلجھتی رہی ..... اُلجھتی رہی اور سوچتی رہی یہاں تک کہ اس نتیجے پر پہنچی، آخر کو یہ عورت ہے تو کم ذات کوٹھے والی رنڈی نا، اپنی اصل کی طرف تو اسے لوٹنا ہی تھا۔

(کہانی کہاں رُکتی ہے)

××÷××

www.urduchannel.in

ثانیے کی سمٹن

لیٹی لپٹائی نیلوفر نظریں جھکائے مولانا ملالوی کے سامنے دوزانو بیٹھی ہوئی تھیں' سراپا سوال بنے' یوں کہ پنکھڑی سے ہونٹوں کی جنبش میں سرِ بیکراں کی دَبازَت تھی۔

دِھیرے سے کچھ کہا گیا تھا ..... ایسے کہ قلبِ جاں کے پاتال میں غوطم چارہ ہوا تھا

.....مگر سنا کس نے تھا؟..... دھیان کی کائی زدہ چٹان سے لفظوں کے نرم پاؤں رپٹ گئے تھے اور جو بازگشت ساعت کے کاٹک میں آبیٹھی تھی اُس کے اُجلے پروں کی پاستانی پھڑ پھڑاہٹ اور جُگل ہنجبیوں کی جھن جھنکار سارے میں تھرائے جاتی تھی۔

مولانا ایک لمحے کے کئی ہزارویں حصّے میں جہاں تھے' وہاں نہیں تھے ..... اور جہاں وہ تھے وہاں چاروں اور نور سا گھل رہا تھا۔ اس نوردھارے میں جو کچھ تھا وہ اگرچہ پوری طرح مستور تھا' نہ بالکل عیاں' تاہم مانوس ہونٹوں کی دل گداز لرزش صاف دِکھتی تھی اور لشٹم پشٹم ماضی کی کھڈی پر چڑھتے وہ لمحے بھی' جو ریشہ ریشہ اُس لعاتی لبادے کا تانا بانا بن رہے تھے جو اُن کی شخصیت کا ستر تھا۔

کسی کو یوں دیکھنا' چاہے ایک خُرد لمحے ہی میں سہی' اُن کی تربیت کا حصّہ نہ تھا کہ پلید دنیا اور اُس کی ساری آلائشیں اُن کے لیے خارش زدہ کتے کے مصداق تھیں۔ انھیں بتایا گیا کہ لذتِ نگاہ بھی ایسی ہی آلائش کی فرع ہے۔ انھیں سارے اسباق ازبر تھے' دانش کی تسبیح کے

سارے موتی اُن کی پوروں کے لمس پر رہتے تھے' حکمت کے سارے ستارے ذہن کے فلک پر چمک رہے تھے ..... مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اذا کان معک لا بنالی بالنجوم تو اُن کے ساتھ ہوا یہ تھا کہ انھیں ہر ایک نجم الثاقب کی روشن قلعی تب اُچٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جب صرف ایک مہتاب کی ساری چاندنی نے اُن کے چشم احاطے کو محیط کر لیا تھا

یوں کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا'

اور یوں کہ وہاں سب کچھ تھا۔

مزید تقسیم ہونے کی سکت نہ رکھنے والے اُس خُرد لمحے کے دریدہ دامن سے ابھی ابھی وہ سب کچھ معدوم ہو گیا تھا جو مانوس اور مہربان ہونٹوں کی جنبش سے لے کر نامانوس جواں ہونٹوں کی لرزش تک کی فترت میں پڑتا تھا۔ تاہم اس تار تار دامن کے غلول میں جو کچھ تھا وہی یوں سب کچھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ادراک کی وسعتوں میں نہ سماتا تھا ..... اور سارا بدن بھی اسی کی زد پر تھا۔

وہ بدن جو زد پر تھا' اُس کا خلیہ خلیہ بصارت بن گیا تھا' نہیں وہ تو سماعت بھی تھا اور شاید شامہ' ذائقہ اور لامسہ بھی' کہ وقت کی اِس ننھی اکائی میں سارے حواس ایک ہی نقطے پر مرکوز ہو گئے تھے۔ اس کُلی ارتکاز کے مقابل رس بھرے ہونٹ قاشوں کے علاوہ سوتواں ناک کی مہین پھنگی پر خدنگ کی انّی کا سا ستارہ تھا' جو بہکاتا تھا اور نئی راہ بھی سجھاتا تھا۔ تنی ہوئی اُجلی جلد تھی کہ جو تصور کے چھو لینے پر رسنے کو تھی اور اِسی پوست کی وہ خاص رنگت تھی جو نہ تو نری شفق پھوار تھی اور نہ ہی صرف دودھ کی دھار۔ انھیں یوں گماں ہوا تھا جیسے شہاب ثاقب جب پہلی بار ٹوٹا ہو گا تو اُس کے کوندوں کی کشاکش عین اِسی کافر اندام کے لیے محفوظ مرمریں مٹی پر جھکے تخلیق کے کسمھ ہی پر ہوئی ہوگی کہ ایک ایک شاخ نہال اپنے آخری قطرے تک نچڑے جاتی تھی اور ہر ہر قطرہ صدیوں کی مسافت طے کرتا رُخساروں تک' لبوں تک' گردن اور پیشانی تک حتیٰ کہ کانوں کی لَوؤں تک اور شاید اُس بدن تک بھی جو پوری طرح لپٹا ہوا تھا' بس اِس قدر پہنچ پا رہا تھا کہ شہابی رنگ کا دِل آویز شائبہ سا گھول دیتا تھا۔

www.urduchannel.in

مُرد لمحے کے تلذذ و تملق کا ٹھہراؤ سہوِنظر اور قصدِ نظر کا تفاوت مٹائے دیتا تھا مگر حرمت و حِلت کی تمیز کیسے مٹ پاتی کہ یہ اُن کی مٹی میں کھنکتی تھی۔ لہٰذا نظارے کے بھرپور تمتع سے ایک کھٹکا سا ہوا' ایسا کھٹکا جو دو متخاصم و مُتبادِر ساعتوں کے رتق و فتق میں تب ہوتا ہے جب وہ آدمی کے اندر اُتر جاتی ہیں۔ ایسے میں دھیان کا سارا ارتکاز بکھر بکھر جاتا ہے۔

مولانا ملالوی کا دھیان بھی بکھرنے لگا تھا' یوں جیسے پوروں اور ہتھیلی کے لمسِ لعوق میں تسبیح کے دانے ہوں' گول اور پھسلواں' ایک دانے پر دباؤ بڑھے' وہ آگے کو کھسکے' ڈوری تنے' تانت سہار نہ پائے تو ڈوری ٹوٹے' دانہ پھسلے' نکلے' اُچھلے اور پرے جا پڑے۔ ہاتھ اُسے تھامنے کو آگے بڑھے' کُھلے اور ہتھیلی میں ٹھہرے لمس اُنڈیلتے سارے دانے جھولتی ڈوری کے ٹوٹے سرے سے ایک ایک کر کے نکلتے اور دُور لڑھکتے چلے جائیں ایسے کہ پوریں ہوا ہی میں تجھیر تجھیر کرتی رہیں۔

مولانا اِدھر اُدھر دیکھے جاتے تھے جیسے اُن کے سارے دانے گُھپ اندھیرے کی پَرات میں گر گئے ہوں۔ انھیں کُچھ سُجھائی نہ دے رہا تھا اور سمجھ ہی نہ آ رہا تھا کہ دِھیان کی ٹھٹکی ہوئی پوروں کو کس جانب تحرک دیں' مُردلمحہ کیا ٹلا تھا آنے والے وقت کی ایک ایک اکائی قرنوں پر تنتے جاتی تھی۔

دوشاخے غُلیل وقت سے بندھی اور تنی ربڑ جیسی ساعتوں میں عجب وسوسے کا غُلّہ تھا۔ تانت اُترنے پر یہ غُلّہ چھوٹ کر زناٹے سے ایک شفاف کانچ پر آ پڑا تھا۔ یہ کانچ وہی تھا جس میں رفتہ وقت کی نور باف ساعتیں اُس عکس دِل نہاد میں مختلط ہو رہی تھیں جو مُرد لمحے کے ٹھہراؤ اور پھیلاؤ سے پھوٹ بہا تھا...... ایک چھناکا ہوا تھا' اُن کے اندر ہی اور سارے میں کرچیاں بکھر گئی تھیں وہاں' جہاں دِھیان تسبیح کے پھسلواں دانے تھے۔

دِھیان دھاگہ ٹوٹنے پر بدن میں صرف ٹھنک تھیر اُتری تھی مگر وسوسے کا غُلّہ جو پڑا تو ہر کانچ کرچی سے طبل 'تخت کساء' کی گونج سنے جاتے تھے۔

تن کے طباق میں بڑی خواہش کے طعمے پر پلنے والا النفس بھی طباقی کتے ایسا ہوتا ہے'

رکیل' مفت خورا اور طفیلیا۔ شروع شروع میں اُسے صرف روح کی ہمرہی کی ہٹ ہوتی ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ یہ روح کے حصے کی ہنڈیا پر ہتا پھیرنے لگتا ہے اور آخر کو اپنے جبڑے رسال شہ رگ پر گاڑ کر اُس سے رت رس ڈیک ڈکوس کر اُسے لجلجا کر دیتا ہے' یوں کہ روح کا ہونا اور نہ ہونا ایک سا ہو جاتا ہے۔

مولانا ملالوی نجس نفس کے حیلوں بہانوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے' نظر کو یوں نظارے کا اسیر پایا تو کھٹک اور وسواس کی عصا تھام لی۔ دُم ہلاتے' بدن اکڑاتے' کان اُٹھا کر پھڑپھڑاتے اور رالیں بہاتے نفس پر اندر ہی اندر چڑھ دوڑے اور مَن ہی مَن میں دُر دُر پھٹ پھٹ تو تو کر کے اُسے اُس کے پچھلے قدموں پر بٹھا دیا اور اس پیش بندی کے سبب کہ وہ پھر سے نہ اُٹھ کھڑا ہو' نیلوفر کے چہرے سے نظر سمیٹ کر ملک فہیم ریاست کے چہرے پر جما دی تھی۔ چُپکی سادھے ہونٹوں کے پیچھے' فرشِ زبان کے اوپر تالو کی محراب تلے حاشا ثُم حاشا کے ورد کی گونج اُٹھا کر خود کو سمجھا بجھا لینا' دِل کو جبر جباری سے منا لینا اور زور زوری' زاری کرتی نظریں کہیں سے اُٹھا کر کہیں نکالینا بظاہر ممکن ہو گیا تھا۔ مگر فی الاصل وہ حسّاً وّلا اَفیسً کے جھمیلے میں پڑے ہوئے تھے۔

ایک آواز تھی کہ جو دِل سے اُٹھتی تھی' اپنے زیر و بم میں ہونٹوں کی کپکپاہٹ لیے اور اپنے اسراع میں نرم گرم سانسوں کا ارتعاش لیے وہ سنتے تھے اور سنتے چلے جاتے تھے یوں کہ ساعتیں اُس کا رَس چاٹتی تھیں مگر اس آواز سے وابستہ چہرہ نظر کے سامنے نہ تھا اور جو چہرہ سامنے تھا اُس کی آواز کہیں درمیان میں ہی ٹوٹ کر گر گئی تھی حالاں کہ وہ چاہتے تھے کہ اُسے سنیں' کامل توجہ سے اور حتمی نتیجے پر پہنچیں۔

اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح یکسو ہو پاتے ملک صاحب اپنی بات مکمل کر چکے تھے اور مولانا کو یوں دیکھے جاتے تھے جیسے فیصلہ چاہ رہے ہوں۔ مولانا فیصلہ کیا کرتے کہ ابھی تک فاصلے کو پاٹ نہ پائے تھے حتیٰ کہ 'رائ العلیل علیل' کے پیش نظر کچھ کہنا مؤخر کر دیا۔

جس آن مولانا معذرت کو مناسب الفاظ تلاش کر رہے تھے اُسی آن ایک سہم کی چاپ چپکے سے ملک صاحب کے مَن میں اُتر گئی تھی۔ فیصلے کو منتظر آنکھیں اِسی چاپ کی دھمک

www.urduchannel.in

سے بدک کر نیلوفر کو دیکھنے لگیں اور انھیں یوں لگا تھا جیسے سوئی کا پھاوڑا بنی بات محبت کی ساری زمین کھود کر کھائی بنا رہی تھی۔ ایسی کھائی جسے ممکنہ فیصلہ سننے کے بعد اتنا چوڑا اور اتنا گہرا ہو جانا تھا کہ نہ تو اُسے الانگنا نیلوفر کے بس میں رہے گا نہ وہ خود اُسے پھلانگ پائیں گے۔

کچ کرچ آتے لمحوں سے جھانکتے وسوسے پر پھاوڑا پڑتا تھا اور تعلق کی ساری نرم نرم مٹی کاٹ کر پرے پھینک دیتا تھا۔ انھوں نے بوکھلا کر مولانا کی سمت دیکھا اور مزید سہم کر ہم زانو نیلوفر کی کلائی یوں تھام لی جیسے اَب جو چھوٹی تو پھر کہیں نہ تھام پائیں گے۔ ملک صاحب مولانا کی طرف دیکھے بغیر پھولوں کی ڈالی سی کلائی کو آہنی پنجے میں جکڑ کر اور تقریباً کھینچتے ہوئے تیزی سے اُٹھے تھے کہ جیسے اَب تلک حجرے میں نہ تھے جلتی آگ پر دھرے توے پر بیٹھے رہے تھے۔

چارزانو بیٹھے مولانا کو ملک صاحب کا یوں اُٹھنا عجیب سا لگا تھا اور نیلوفر کا ہاتھ اتنی سختی سے پکڑ کر اور یوں بے دردی سے کھینچ کر اُٹھانا سخت معیوب سہی' مگر جب ملک صاحب نے یہ کہا تھا کہ 'فتویٰ لینے کو پھر آئیں گے' تو وہ قدرے مطمئن ہو گئے تھے اور ہونٹوں پر پپڑی کی صورت جمے مخمصے کو وہ اَب اطمینان سے حلق میں اُتار کر لمبا سانس بھر سکتے تھے۔

جب مولانا بہت سی ہوا اپنے سینے میں بھر چکے تو انھیں یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے حجرے میں نہ تھے گزرے وقت کی ناغول میں بیٹھے ایک دِل خوش کُن تصور باندھنے کے جتن کر رہے تھے' ایسا تصور جس کی شیرینی دھاریں بن بن کر حلقوم میں اُترتی تھی' مگر ہونے یہ لگا تھا کہ جلد ہی یہ مٹھاس الکن ہو کر چبھنے لگی تھی' وہ یوں کہ جس اُجلی صورت سے تصور جوڑتے تھے اُس سے نظر پھسل پھسل جاتی تھی یا پھر کچھ ایسے ہوتا کہ نظر تو وہی جمی رہتی' منظر کی ساری امی جمی اِدھر اُدھر ہو ہوا جاتی۔

انھوں نے سر جھٹک کر گردن چھوتی زلفوں کے بیچ کانوں کی لووں تلے لرز جانے دیئے' نہڑائی گردن اٹھا کر چوندھیل دیکھا اور ایک ایک شے اور اُس سے وابستہ احساس کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا' چولوں میں ہک دَک چھپائے دروازہ اور اُس کی چوکھٹ' چوکھٹ کو خاموشی سے قابو کیے چکنے گارے سے لپی دیواریں' دَم سادھے کھڑی دیواروں کے ٹخنوں سے

چمٹی چوکیاں اور چھاتی سے لگے تختوں پر اوپر تلے پڑی کتابیں' کتابوں کی بوسیدگی میں ڈوبتے چونچال لفظوں کے پرّے' الفاظ کے پرّدوں میں چھپی مین میکھ کی تاریکی ......اور وہ گاڑھی سیال تاریکی بھی جو جھلا بُو رہو کر انھیں ڈبوئے جاتی تھی۔

وہ دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے یا پھر محسوس کیے جاتے تھے اور دیکھے جاتے تھے ... حتیٰ کہ انھیں نور احمد لُنیا یاد آئے جو کہا کرتے تھے کہ حُسن کے اجزائے ترکیبی چاہے نظارہ' سماعت اور لمس ہوں یا خوش بو بن کر مشامِ جاں معطر کریں۔ لذت ہو کر روح میں اُتریں یا لطف کے ارتفاع سے بدن کو مُرتفع کریں۔ ایک ہی جگہ ساکت ہو جائیں یا اپنی رواں لہروں میں اردگرد کے مظاہر کو بھی ساتھ بہائے چلیں' فی الاصل حقیقت ہی سے مستعار ہوتے ہیں۔ مستعار بھی کیا حقیقت ہی کا مظہر اور حصہ۔ ایسا سوچ کر دراصل مولانا مُرد لمحے میں اَپنی آنکھ پر کھلنے والے نیلوفر کے رُخ روشن کے نظارے کو تصور کے پردے پر ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھ لینے کا جواز فراہم کر رہے تھے۔

جواز انھیں مل چکا تو وہ ایک متحرک منظر کے ساکت رہ جانے والے مظہر کو حقیقت کُلّی سے جوڑ کر کیف کی کن من میں بھیگے جاتے تھے۔ پوری طرح بھیگ چکتے تھے تو خود کو نچوڑتے تھے' یوں جیسے گیلے کپڑے کو پیچ ڈال ڈال کر نچوڑتے ہیں۔ نچڑ چکتے تھی تو پھر کیف کی جھمر جھمر تلے آ کھڑے ہوتے تھے۔ عجب بھیگ تھی کہ روح میں اُترتی تھی اور مست کیے دیتی تھی۔ اور عجب نچڑنا تھا کہ ریشے ریشے کے بیچ کا خالی پن نئی بھیگ مانگتا تھا۔

قبل ازیں مولانا اس طرزِ احساس سے شعوری طور پر احتراز فرماتے تھے کہ نور احمد لُنیا راہِ سلوک پر چلتے ہوئے مجذوب اور مجنون ہو کر اُن کے اندر خوف کی دہکتی ہوئی چنگاری رکھ گئے تھے۔ اگرچہ مولانا دنیاوی اعتبار سے بہت شاندار اور قابلِ رشک زندگی نہ گزار رہے تھے' امام مسجد اور خطیب کا وقار اُن کے اندر کی طلب سے کہیں کوتاہ تھا۔ تاہم وہ سمجھوتہ کر چکے تھے اور اسے فی الحال غنیمت جان کر اس سے جُڑے رہنا چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ مُتصوف ہونے کی بجائے متکلم رہنا انتخاب کر چکے تھے اور کلام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ اُن کے

www.urduchannel.in

نزدیک یہی وقت کا تقاضہ بھی تھا اور حکمت بھی۔ اپنے خطبات میں ''تدبرون'' اور ''تشعرون'' جیسے الفاظ موتیوں کی صورت پرو لینے والی آیات کثرت سے تلاوت فرماتے تھے کہ فقط عشق اور محبت کی راہ اُن کے نزدیک پھسلن ہی پھسلن تھی۔ وہ اسے ایمان بنائے ہوئے تھے کہ عشق و محبت کے جذبے اپنی نہاد میں انفعالیت سے مملو ہیں' جب کہ انفعالی تدبر و شعور کی بلندیوں کی طرف محوِ خرام ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم لاشعور کے کسی تقاضے کے تحت ''یومنون'' یا اس سے ملتے جلتے الفاظ والی آیاتِ مبارکہ اُن کے ہونٹوں سے یوں کمالِ لطف سے ادا ہوتیں کہ انسانوں کا تدبر و شعور فقط دھوکا لگنے لگتا اور ایمان ہی علتِ غائی اور اصل الاصول رہ جاتا تھا۔

ایسے میں اُن کی گفتگو سے یہی مفہوم کشید کیا جا سکتا تھا کہ حقیقتِ مطلق کی ہستی کا تعین لامعرف اور غیر انقسام پذیر ہے۔ کمال کو اُس کے مظہر سے اس لیے نہیں جانا جا سکتا کہ العین کی صفات الگ ہیں اور جلوہ ہائے ذات الگ۔ ممکن ہے کسی اُلجھن سے بچنے کی لیے وہ معرفت کی منہاج علم اور نور کو بتایا کرتے ہوں تاہم اُن کا طرزِ عمل ایسا تھا کہ بجا طور پر گمان ہونے لگتا تھا کہ وہ اسی پر صدقِ دل سے ایمان رکھتے تھے۔ اس کا واضح ثبوت تو وہ نادر و نایاب کتب کا خزانہ تھا جن کے چنیدہ الفاظ اکثر ان کی ہونٹوں پر رہتے تھے اور اُن کے فرشِ دل پر تہ جماتا وہ نور بھی' جو گاہے گاہے اُٹھ کر چھاتی اندر پھسلنے لگتا تھا تو سارے میں پنجیاں بج اُٹھتی تھیں۔

مُحرِ لمحے میں نیلوفر کے صدقے یہی پنجیاں ایک بار پھر جھن جھن کرنے لگی تھیں اور اُن کی یادداشت کا غالب حصہ محیط کر لینے والا وقت اپنی ایک ننھی سی اکائی میں حلول کر کے عجب لذت دے رہا تھا۔ ایسی لذت جس سے وہ نکلنا چاہتے تھے' یہاں تک کہ وہ یہ تسلیم کر لینے پر مجبور تھے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ ذاتِ باری تعالیٰ عینِ حُسن ہے اور روحِ انسانی اس کا ایک عکس اور صدور' تو وہ بھی اپنی جگہ درست ہی کہتے ہیں۔

کمالِ جمال تک پوری توانائی سے تحریک دینے والی وقت کی قیامت زا اکائی کی گرفت دوسرے روز ہی ڈھیلی پڑ گئی تھی کہ انتظار کی کٹاری نے اُسے لخت لخت کر دیا تھا۔ اَب وہ صرف انتظار کرتے تھے اور کُڑھتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جو انھوں نے دیکھا تھا' اپنی ننگی

آنکھوں سے' وقت کی انتہائی محدود اکائی میں' اور محسوس کیا تھا پوری شدت سے اور تسلسل کے ساتھ' وہ سب ایک خواب تھا' دھندلا سا خواب۔ یہاں تک کہ اسی کیفیت میں لگ بھگ تین ماہ سے زائد عرصہ گزر گیا' حتیٰ کہ وہ نا اُمید سے ہو چلے تھے کہ انھوں نے ملک فہیم ریاست کو حجرے کا دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھا۔ مولانا پر کئی لمحے یکدم پھوار بن کر ایک ساتھ برس پڑے تھے۔

یوں تو ملک صاحب اکیلے ہی آئے تھے مگر مولانا کو یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ ایک مانوس خوش بو بھی لائے تھے۔ اس خوش بو سے سارا حجرہ بھر گیا تھا۔ مست کر دینے والی خوش بو میں مولانا اس مسئلے کی بابت استفسار کرنا بھول گئے تھے جس کے وسیلے سے اُن کے اندر اتھل پتھل ہونے لگی تھی وہ آنے والے کا وجود بھی اسی خوش بو میں ڈوبتا دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح ملک صاحب کو نظر انداز کر دیتے' آنے والے نے اطلاع دی کہ وہ عقد ثانی کر رہے ہیں اور اصرار کیا کہ مولانا ہی کو عقد پڑھانا ہوگا۔

مولانا ملالوی ہکا بکا انھیں دیکھنے لگے تھے اور جب اصرار بڑھا تو انھیں وعدہ بھی کر لینا پڑا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ بارات کے ساتھ دوسرے شہر پہنچے اور قدِ آدم آئینوں کے مقابل جا کھڑے ہوئے' یوں کہ بس خود ہی کو دیکھے جاتے تھے۔ ایسے میں انھوں نے خُرد لمحے کو جھپاک سے عیاں بدن کی سنسناتی پوست پر تیرتے اور پھسلتے ہوئے محسوس کیا تھا اور بغیر کسی مدافعت کے اُسے خلیے خلیے میں' رگوں میں' حتیٰ کہ روح تک میں اُتر جانے دیا تھا۔

(کہانی یہاں پہنچ کر آگے بڑھنے سے انکاری ہو جاتی ہے' مگر کب تلک۔۔۔)

××÷××

www.urduchannel.in

میں جدید طرز کے خوب صورت ریپر میں لپٹی چیونگم کی جانب لپکا اُسے اٹھایا اور جھٹ کھول لیا۔ رنگین ریپر کو کوڑے کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے بھی میں نے اس پر بنے بیل بوٹوں کے نئے پن کی بابت نہ سوچا تھا کہ چیونگم سے اُٹھتی مہک نے اُسے جھٹ ہونٹوں میں دبا لینے کی اِشتہا بڑھا دی تھی۔ پہلے پہل میں نے چیونگم چبانے سے اِجتناب کیا، اُس کا رَس میرے لعاب میں مل کر حلق میں اُترنے لگا تو اسے دانتوں تلے کچلنے لگا کہ کچھ اور مٹھاس میسر ہو۔ حتیٰ کہ باقی بچ جانی والی چیونگم جہاں رَسال مٹھاس اُتار رہی تھی وہاں بے رَس کڑواہٹ اُتارنے لگی۔ اِسی اثنا میں، میں نے ایک بچے کو دیکھا جس نے چیونگم چباتے ہوئے، اُسے ہونٹوں کے بیچ رَکھ کر غبارہ بنالیا تھا۔ وہ اُسے پھولاتا گیا؛ یہاں تک کہ وہ پھٹ گیا۔ اسی میں اُسے لطف آرہا تھا۔ میں نے بھی ویسا کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ شاید میں کچھ زیادہ بڑا ہوگیا تھا۔ جب چبائی جانے والی چیونگم کی کڑواہٹ ناقابلِ برداشت ہوگئی تو میں نے اُسے ایک جانب تھوک دیا۔ کڑوی کسیلی گولی کو جہاں تھوکا گیا تھا، وہاں میری نظریں جم گئیں؛ شاید اُس کی تلاش میں۔ وہ وہاں نہ تھی۔ دُھول میں اَٹی ہوئی اگر کوئی چیز وہاں تھی تو وہ برتی ہوئی، مسلی ہوئی کچلی ہوئی بے لذت زندگی تھی جب کہ میرے حلقوم میں عجب نوع کا کسیلا خالی پن بہہ رہا تھا۔

محمد حمید شاہد کی دیگر کُتب

=بند آنکھوں سے پرے (افسانے) ۱۹۹۴ء
=جنم جہنم (افسانے) ۱۹۹۸ء
=مرگ زار (افسانے) ۲۰۰۴ء
=مٹی آدم کھاتی ہے (ناول) ۲۰۰۷ء
=محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے (انتخاب توصیف تبسم) ۲۰۰۸ء
=پارو (منتخب افسانے: انتخاب و سرائیکی ترجمہ اصغر عابد) ۱۹۹۹ء

-xx-

=ادبی تنازعات (تنقیدی مضامین، انتخاب: روف امیر) ۲۰۰۰ء
=اردو افسانہ صورت و معنی (فکشن کی تنقید، انتخاب: یٰسین آفاقی) ۲۰۰۶ء
=کہانی اور یوسا سے معاملہ (فکشن کی تنقید: مقدمہ محمد عمر میمن) ۲۰۱۱ء

-xx-

=پیکرِ جمیل (سیرت النبیؐ) ۱۹۸۴ء
=لمحوں کا لمس (تضمین) ۱۹۹۵ء
=الف سے اٹکھیلیاں (طنزیے) ۱۹۹۵ء
=سمندر اور سمندر (بین الاقوامی شاعری کے تراجم/انتخاب ارشد چہال) ۲۰۰۰ء
=اشفاق احمد: شخصیت اور فن (بہ اشتراک اے حمید) ۱۹۹۸ء
=The Touch of Moments(Prosody Crumbles) ۱۹۹۵ء

-xx-

=پاکستانی ادب ۲۰۰۲ (بہ اشتراک منشا یاد) ۲۰۰۳ء
=سارک ممالک: منتخب تخلیقی ادب (بہ اشتراک انور زاہدی) ۲۰۰۴ء
=آٹھ اکتوبر: تحریر کے آئینے میں (بہ اشتراک دیگر) ۲۰۰۶ء
=تخلیق، تنقید اور نئے تصورات (تنقید فاروقی سے انتخاب) ۲۰۱۱ء

-xxx-

www.urduchannel.in

محمد حمید شاہد کی دیگر کُتب

= بند آنکھوں سے پرے (افسانے) ۱۹۹۴ء
= جنم جہنم (افسانے) ۱۹۹۸ء
= مرگ زار (افسانے) ۲۰۰۴ء
= مٹی آدم کھاتی ہے (ناول) ۲۰۰۷ء
= محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے (انتخاب توصیف تبسم) ۲۰۰۸ء
= پارو (منتخب افسانے: انتخاب و سرائیکی ترجمہ اصغر عابد) ۱۹۹۹ء

-xx-

= ادبی تنازعات (تنقیدی مضامین، انتخاب: رؤف امیر) ۲۰۰۰ء
= اردو افسانہ صورت و معنی (فکشن کی تنقید، انتخاب: یٰسین آفاقی) ۲۰۰۶ء
= کہانی اور یوسا سے معاملہ (فکشن کی تنقید: مقدمہ محمد عمر میمن) ۲۰۱۱ء

-xx-

= پیکرِ جمیل (سیرت النبیؐ) ۱۹۸۳ء
= لمحوں کا لمس (نظمیں) ۱۹۹۵ء
= الف سے اٹکھیلیاں (طنزیے) ۱۹۹۵ء
= سمندر اور سمندر (بین الاقوامی شاعری کے تراجم/انتخاب ارشد چہال) ۲۰۰۰ء
= اشفاق احمد شخصیت اور فن (بہ اشتراک اے حمید) ۱۹۹۸ء
= The Touch of Moments(Prosody Crumbles) ۱۹۹۵ء

-xx-

= پاکستانی ادب ۲۰۰۲ (بہ اشتراک نشایاد) ۲۰۰۳ء
= سارک ممالک: منتخب تخلیقی ادب (بہ اشتراک انور زاہدی) ۲۰۰۴ء
= آٹھ اکتوبر: تحریر کے آئینے میں (بہ اشتراک دیگر) ۲۰۰۶ء
= تخلیق، تنقید اور نئے تصورات (تنقید فاروقی سے انتخاب) ۲۰۱۱ء

-xxx-

یقین جانیے میرے لیے، فقط لکھنا اور اس لکھنے کے عمل سے حظ اُٹھانا کبھی اہم نہیں رہا، کہ میں تو زندگی کے بھیدوں بھرے کھدو کو کھولتے چلے جانے سے، اور ہر تہ کے اُترنے پر بے پناہ حیرت یا شدید صدمے کے مقابل ہو جانے کو ہی تخلیقی عمل کی عطا سمجھتا آیا ہوں۔ سو یہ افسانے بھی انہی لمحوں کی دین ہیں۔ وہ جو کیس ہسٹری سے باہر قتل ہو جاتی ہے یا پھر پہاڑوں سے رزق کی تلاش میں اُتر کر آنے اور زندگی کی اشتہا کا گرفتار ہو جانے والا آدمی، ملبے میں دھنسا ہوا ماسٹر فضل جو، بکھرے ہوئے وجود والا کامران، قدرکی میزانِ عدل پر تلنے والی زوجیں، ککلی کلیر گاتی بچیاں، بھرکس کہانیوں کا پشتارہ اُٹھائے اُٹھائے پھرنے والا، بچی کا جنازہ اُٹھنے پر بین کرنے والی ماں، وہ مرا ہوا شخص جسے زندگی کے بخیے لگانے تھے، اکیلی رہ جانے والی عورت جس کی رانوں پر لجلجا اندھیرا گدگدی کیا کرتا، خالی کنستر کی طرح بجتی زندگی والا راوی کردار، کوک بھرے کھلونے کا سا ایک اور کھلونا، ماں کی دودھ جیسی بغل میں جھانک کر مُغلئی پھوڑے کو آنکھ میں بھر لینے اور لذتِ تن کا اسیر ہو جانے والا عالم یا پھر وہ لڑکی جس کے اُجلے بدن کو متعفن پانیوں کی دھار نے بھگو دیا تھا، یہ سب کردار میرے وجود کا حصہ ہیں، میری حیرتوں کے راز داں اور میرے دُکھوں کے شریک۔ سو ان افسانوں کو پڑھیے اور اس درد اور اذیت کو آنکیے جو تخلیقی سطح پر زندگی کرنے والوں کا مقدر ہے۔

Misaal
misaalpb@gmail.com
Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284
9789695811450